آسیہ رفیق

بے بسی

"امّاں۔!" ان کے منہ سے نکلا۔ آواز بلند تھی۔ وہ گھبرا کر تکیے سے سر اونچا کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یقیناً خواب دل ہلانے والا تھا۔ نیند سے بیدار ہو کر دل کی تیز دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگے۔ سرہانے رکھی سگریٹ ٹٹول کر اُٹھائی اور لائٹر کی تلاش میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگے۔

"کیا ہوا؟ یہ اتنی زور سے آپ نے اماں کہہ کر پکارا تھا؟ کسے؟"

نازک سی حسین خفتہ کچی نیند سے جاگنے پر گلابی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کی محبوبہ محبوب بیوی، محرم راز، شریکِ زندگی، خوشیوں کی ساتھی۔

وہاں۔ بڑا خوفناک خواب تھا، سوتے میں میں نے اماں

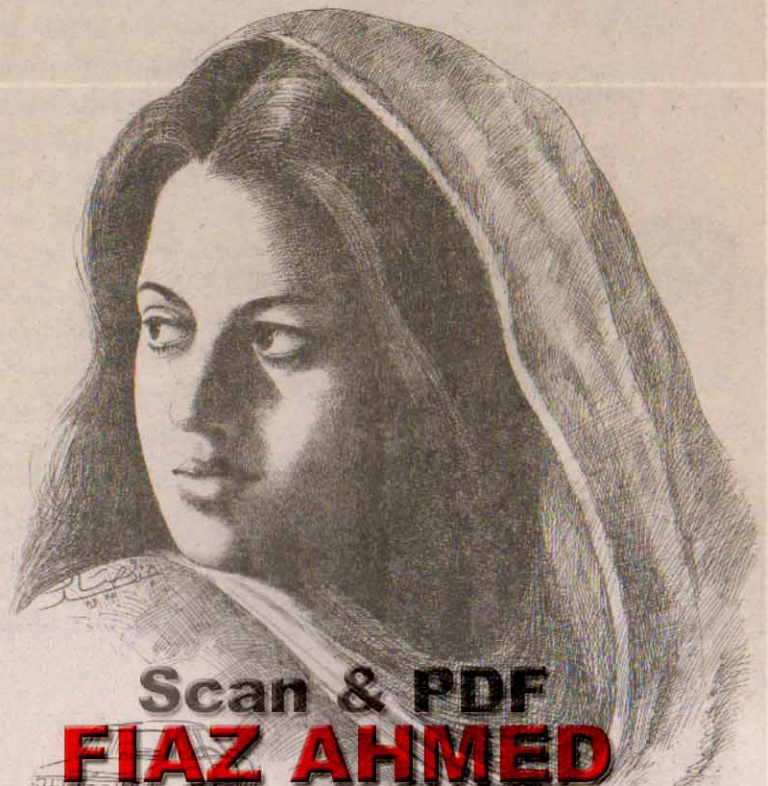

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com

بیگانہ

آسیہ رفاقی

"اماں۔!" ان کے منہ سے نکلا۔ آواز بلند تھی۔ وہ گھبرا کر تکیے سے سر اونچا کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یقیناً خواب دل ہلانے والا تھا۔ نیند سے بیدار ہو کر دل کی تیز دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگے۔ سرہانے رکھی سگریٹ ٹٹول کر اٹھائی اور لائٹر کی تلاش میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگے۔

"کیا ہوا ہے یہ اتنی زور سے آپ نے اماں کہہ کر پکارا تھا؟ کسے؟"

نازک سی حسین خجستہ کچی نیند سے جاگنے پر گلابی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کی محبوبہ، محبوب، بیوی، محرم راز، شریکِ زندگی، خوشیوں کی ساتھی۔

وہاں۔ بڑا خوفناک خواب تھا۔ سوتے میں میں نے اماں کو پکارا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں غیر محفوظ ہوں۔ جیسے مجھے اماں کے سائے کی ضرورت ہے۔ اور اب لگتا ہے جیسے اماں کو بھی میری ضرورت ہے۔"

"وہم نہ کریں، سو جائیں۔ خوابوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کے سر میں زیتون کا تیل لگا دیتی ہوں۔ خشکی سے بھی نیند بے چین ہو جاتی ہے۔ دس دفعہ کہا ہے اعتدال سے کام کیا کریں۔ مگر آپ کو تو بس کام۔ کام۔ کام کی دھن رہتی ہے، نہ صحت کی پروا، نہ آرام کا خیال۔"

پتلی پتلی نرم انگلیوں سے وہ ان کے سر میں تیل ملتی رہی۔ نیند آنکھوں سے اڑی تھی۔ اس کا تعلق سر کی خشکی سے تھا نہ بے آرامی سے۔ انہوں نے وہ خواب کیوں دیکھا؟ دیکھا ہی تھا تو مدد کے لیے اماں کو کیوں پکارا؟ وہاں اور بھی کئی لوگ تھے۔ دادا تھے، چچا تھے، مگر اماں کا لفظ چیخ بن کر سر سراتا ہوا بلند ہوا تھا۔ شاید لاشعور میں ابھی تک اماں سے تحفظ ملنے کا تصور موجود تھا، مگر انہیں کس کا ڈر تھا؟ کس سے تحفظ درکار تھا؟ کس خطرے سے بچنے کے لیے اماں کو پکارا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اماں کو ہی ان کی مدد درکار ہو؟

وہ چونک کے تکیے پر سر ٹیک کر نیم دراز ہو گئے۔ خجستہ کی مالش کرتی انگلیاں ان کی گردن سے الجھ گئیں وہ حیران ہو گئی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" انہوں نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا لیا۔

"پھر بھی، ایکدم اٹھ کر کیوں بیٹھ گئے؟ سونے کی کوشش

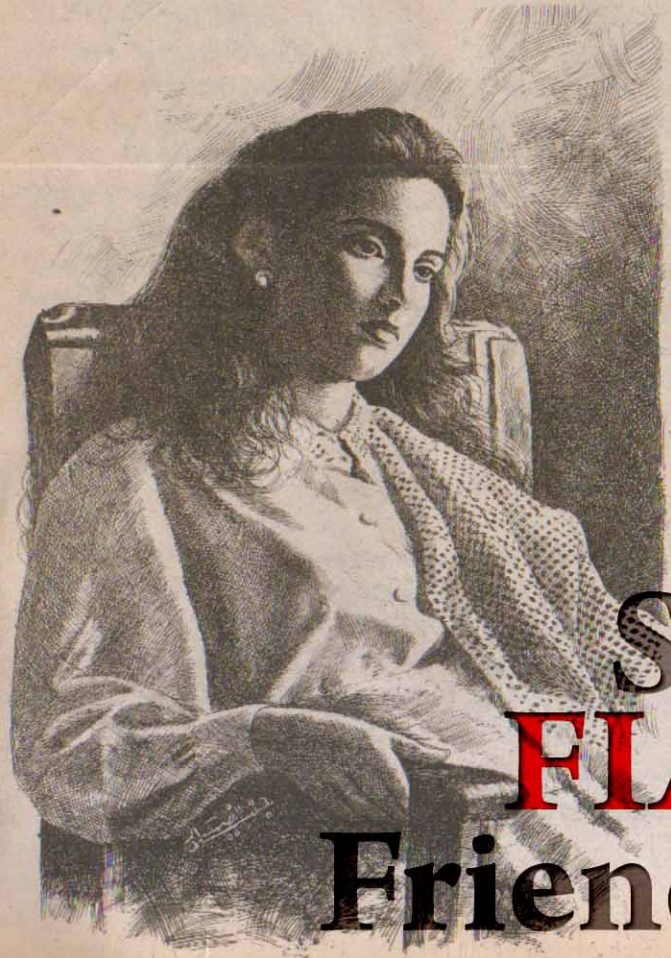

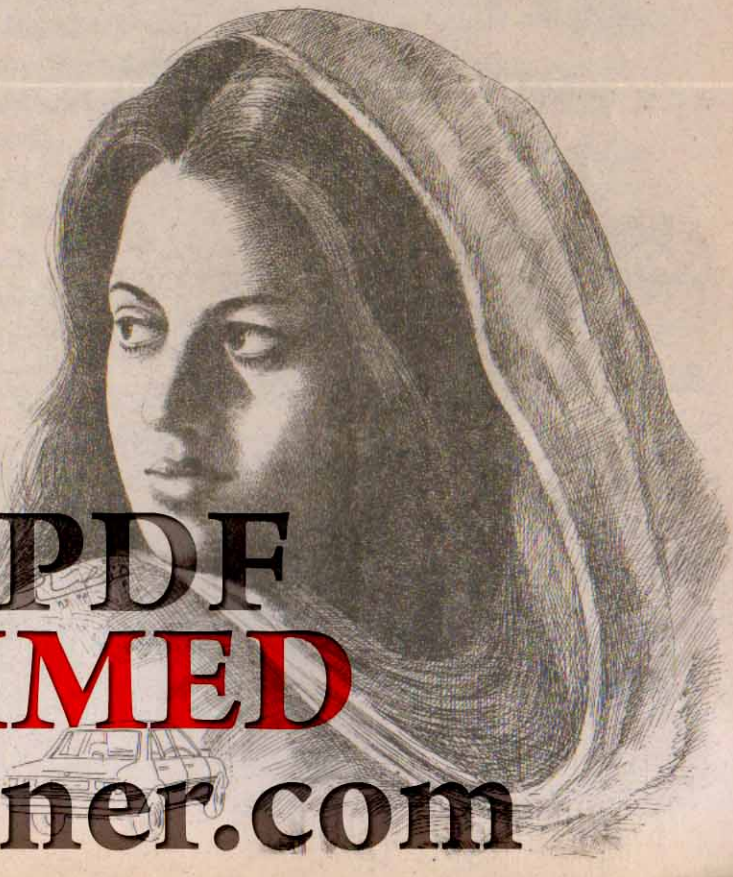

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com

کرتے۔"

"ایسے ہی۔ خیال آیا کہ کہیں اماں کو میری ضرورت تو نہیں ہے؟" آخر اتنے برس کے بعد اماں کو پکارنے کی کوئی وجہ تو تھی۔ کیسی پکار تھی کہ دل میں ہلچل سی مچ گئی۔ نیند اُڑ گئی۔

"خوامخواہ وہم نہ کریں۔ آپ کی اپنی صحت کو لنی اچھی ہے۔ دل کو روگ نہ لگائیں۔ اماں کو ضرورت ہوتی تو وہ کسی نہ کسی ذریعے سے خبر بھیجتیں۔"

"اور اگر۔ وہ خبر بھیجنے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو؟" انہوں نے دل سے سوال کیا۔ اور سگریٹ چٹکتے رہے جب کبھی وہ کسی مسئلے میں اُلجھ جاتے۔ پریشان ہوتے خجستہ کی قربت انہیں ہر دُکھ سے نجات دلا دیتی۔ مگر آج۔ وہ خجستہ کو یونہی بیٹھا چھوڑ کر اُٹھ گئے اور ٹہلنے لگے۔ خجستہ اُلجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ خجستہ کو نظر انداز کر کے اُٹھ جائیں۔ کیسا خوفناک خواب دیکھ لیا تھا کہ اس خواب کے سوا اور کچھ انہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

خجستہ۔ خدمت گزار، اطاعت شعار، بے حد حساس، بیوی تھی۔ اسے شوہر کے ہر ہر انداز سے آگاہی تھی۔ انہیں بھوک لگی ہوتی تو وہ ان کے چہرے سے جان لیتی۔ انہیں بیزار دیکھتی تو بچوں کو لے کر دور ہٹ جاتی۔ غصہ میں ہوتے تو وہ ان کی دیکھ بھال میں لگ جاتی نرم لہجے میں میٹھی میٹھی باتیں کر کے ان کا غصہ ٹھنڈا کرتی۔ وہ صحیح معنوں میں شریک حیات تھی۔ اس کے ان پر بہت احسانات تھے۔ وہ کوشش کرتے تب بھی ان احسانات کا بدلہ ادا نہیں کر سکتے تھے وہ خود ان کے احساس سے آگاہ ہو کر کہتی۔

"میں تو اپنا فرض ادا کرتی ہوں۔ کوئی احسان تو نہیں کرتی۔"

وہ اور بھی متاثر ہو جاتے۔ خجستہ نے ان کا ہر کام اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ وہ ایک ادنیٰ اگیزیکٹو کی طرح ان کے آگے پیچھے پھرا کرتی۔ انہیں کام کی تکلیف نہ ہونے دیتی۔ صبح سویرے سے رات تک وہ لٹو کی طرح گھوما کرتی۔ گو کہ اس مہنگی زندگی میں اس نے ایک باؤس میڈ رکھی ہوئی تھی۔ مگر وہ اس کا حق تھا۔ مسز اَرتھ محض ایک گھنٹے کے لیے آتی تھیں اور کام میں خجستہ کی مدد کر دیتی تھیں۔

صبح کی بیڈ ٹی شیو کے لیے گرم پانی اور شیو کا سامان لا کر رکھنا۔ پھر شیو کے بعد سب چیزیں اُٹھا کر دھو کر رکھنا۔ نہانے کے لیے تولیہ۔ سلیپر، کپڑے باتھ روم میں لے جا کر رکھنا۔ اتنی دیر میں کہ وہ نہا کر فارغ ہوں (اس کا بس چلتا تو وہ نہانے کے لیے بھی ان کو حرکت نہ کرنے دیتی۔ خود ہی نہلا بھی دیتی۔) ناشتہ میز پر لگا دیتی۔ ناشتہ کر کے وہ بچوں کو اسکول چھوڑتے ہوئے دفتر جاتے۔ دفتر میں بھی کئی بار خجستہ کا فون آتا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"تھکن تو نہیں ہے؟"

"اگر سستی آ رہی ہے تو گھر آ جائیں۔ آرام کر لیں۔ انسان کی صحت ہی سب کچھ ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔"

اس کی مدھم بھری آواز، ہمدردانہ لہجہ، محبت سے لبریز جملے ان کی ہر تھکن آن کی آن میں مٹ جاتی۔

اسے ان کا خیال رہتا۔ شادی کے بعد سے آج تک، اس کے رویے میں فرق نہیں آیا۔ انداز میں تھکاوٹ یا بیزاری ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ شادی کے اولین زمانے کی طرح آج بھی ان کے لیے سجی بنی تیار رہتی۔ اپنی میٹھی آواز میں چہکتی بہت اچھی لگتی تھی۔ دفتر سے گھر آ کر ایک خوش آیند سکون ان کے رگ و پے میں گھل جاتا۔ وہ ہاتھوں ہاتھ انہیں کمرے میں لے جاتی۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے جوتے اُتارتی تھکے ہوئے پسیجے ہوئے پیروں کو نرم تولیے سے خشک کر کے ہولے ہولے اپنی موہنی انگلیوں سے مساج کرتی۔ پھر ان کی ٹانگیں اٹھا کر بیڈ پر رکھتی۔ اور دھیرے دھیرے ان کے بازو شانے اور کمر سہلاتی۔ آرام، سکون، آسودگی ان کے آس پاس تیرا کرتی۔ رات ہونے تک پروانہ وار وہ انہی کے گرد گھوما کرتی۔ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ کوئی خواہش؟ جھوک؟

رات کو بچوں کو الگ کمرے میں سلا کر وہ کسی دلدادہ کی طرح سر جھکائے شرمیلی ہوتی ان کی خلوت میں آ جاتی۔ تبھی کبھی وہ سوچتے۔ یہ کسی جن کی نسل سے تو نہیں؟ کبھی تھکتی نہیں۔ بیزار نہیں ہوتی۔ کوئی شکوہ نہیں کرتی۔ غصہ آتا تو اسے پی جانے کا سلیقہ بھی رکھتی۔ اگر کسی دن واقعی کسی بچے پر، ملنے والوں پر یا ان پر غصہ آ جاتا۔ تو وہ برتنوں یا شیشے چینی کے گلاسوں پر اُتارتی۔ انہیں اٹھا کر پٹختی اور چھناکے سے ٹوٹتا دیکھتی۔ پھر غصہ اُتر جاتا تو وہ فرش پر بیٹھ کر گھٹنوں میں سر گھسائے روتی۔

"ہائے میرا کتنا پیارا گلدان تھا۔"

"افوہ! یہ میں نے کیا کر دیا میرا کتنا قیمتی ٹی سیٹ برباد ہو گیا۔"

"ہائے میرا خوبصورت گلاس، کمبخت غصہ بھی کیا کمینی چیز ہے۔ میرے چینی کے برتنوں کا حشر ہو گیا۔"

وہ روتی رہتی اور بین کرتی رہتی۔ پھر مُڑ کر سُرخ آنکھوں سے انہیں دیکھ کر کہتی۔

"آپ مجھے سزائیں نہیں دیتے۔ دیجیے نا سزا تاکہ میں اس ذلیل عادت سے چھٹکارا پا لوں۔"

وہ اسے پیار سے بہلاتے سنبھال کر اٹھاتے اپنے پاس بٹھا کر اس کے گیلے رخسار خشک کرتے۔

"آپ ہی نے میری عادتیں خراب کی ہیں۔ بس میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ ہی ذمہ دار ہیں۔ آپ کو جرمانہ بھرنا پڑے گا۔ اس سے بھی اچھے، پیارے برتن لانے پڑیں گے۔ اچھا۔" وہ اس کی بھولی بھالی اداؤں پر مر مٹتے۔

"میں نے جمعہ کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں بڑا خوبصورت ٹی سیٹ دیکھا تھا۔ بہت قیمتی تھا ہمت نہیں پڑی خریدنے کی۔ اس بار سیل لگے تو وہی سیٹ لے آئیں گے۔"

وہ ناز سے کہتی ان کے سینے میں سر گھساتی۔ دل میں گھس جاتی۔ سیل لگتے میں تو ابھی عرصہ باقی تھا۔

اس کی معصوم اداؤں، ناز و انداز کو نذرانہ دینے کے لیے وہ فوراً جمعہ کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور پہنچ جاتے۔ جمعہ اس علاقے کا "سیٹھ" تھا۔ اور اسٹور پر بہت زیادہ قیمتی سامان رکھا تھا۔ عام لوگ تو وہاں جاتے ہوئے بھی لرزتے تھے۔ مگر خجستہ کی فرمائش ٹالنا آسان نہ تھا، بہت محبت کرتی تھی وہ ان سے۔ ان کے آرام و سکون کے لیے ہر وقت متحرک رہتی۔

وہ بھی جواب میں اس کی خوشی اور آسائش کے لیے بڑے سے بڑا قدم اٹھانے کو ہر وقت تیار رہتے۔ آخر وہ ان کی بیوی تھی۔ محبوبہ دلنواز تھی۔ مگر آج رات جانے کیسی منحوس تھی کہ ان پر خجستہ کی محبت ہی اثر کر رہی تھی نہ اس کی ناز و انداز سے بھرپور ادائیں ہی متوجہ کر رہی تھیں۔ وہ سگریٹ پیے ٹہلتے رہے۔ اماں کو کس لیے پکارا تھا۔ کونسی تحریک تھی وہ۔ پتا نہیں کب انہیں نیند آئی۔ صبح ہوئی تو وہ نارمل تھے۔ آج پہلی بار خجستہ کے چہرے پر تھکن تھی۔ وہ ناشتہ کر رہی تھی۔ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" انہوں نے پیار سے پوچھا۔

"آ۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔"

"تو منہ کیوں بنا رکھا ہے۔ مسکراؤ۔" انہیں خجستہ کی مسکراتی صورت پسند تھی۔

"بس۔ نیند کی کمی کی وجہ سے کچھ۔"

"اوہ۔ ہاں۔ تم سو جاتیں۔ کیا تم بھی جاگ رہی تھیں؟" وہ نادم ہو گئے۔

"آپ جاگیں اور بے چین رہیں۔ میں بھلا سو سکتی ہوں؟" شکوہ کرتی پلکوں پلکیں جھپکتے اور آنسو پینے کی کوشش میں آواز بھی بھاری ہو گئی۔ ان کے احساس پر منوں بوجھ آ گرا۔

"سوری خجستہ۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے، بڑی بے چینی رہی۔ ایسا خواب تو۔"

"ہاں مجھے احساس ہے۔ منحوس خواب تھا میں صدقے کی رقم آج ہی اسلامک سینٹر بھجوا دوں گی۔"

خیالوں میں گم بچوں کو اسکول چھوڑتے ہوئے دفتر آئے۔ اور سوچتے رہے۔ ڈری ہوئی آواز میں اماں کو پکارنا۔ نیند کا اچاٹ ہو جانا۔ بے چینی اور اضطراب کی کیفیت، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت انہیں کسی ہمدرد راز داں کی ضرورت تھی۔ کسی خیر خواہ کی، مشورے کی بھی۔ ان کی انگلیاں فون پر رقم گئیں۔ پھر کچھ دیر بعد وہ کسی سے بات کرنے لگے۔

جمشید نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ خوش باش اور ہمدرد انسان تھا۔ ہر کسی کے کام آنے والا۔ اتفاق سے وہ ان کا ہم وطن تھا۔ سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا کاشتکار۔ انہی کی طرح۔ دونوں کے گاؤں پاس پاس تھے۔ کشمیر کی سرحد کے نزدیک دونوں نے قصبے کے اسکول میں پڑھا تھا۔ پھر ساتھ ساتھ سیالکوٹ کے مرے کالج میں تعلیم حاصل کی دوستی بہت گہری تو نہ تھی مگر تعلق خاطر تھا۔ پھر اتفاق سے دونوں کا انگلینڈ میں بھی ساتھ ہو گیا بالکل اسی طرح جیسے بجوات کے گورنمنٹ اسکول اور پھر مرے کالج سیالکوٹ میں ہوا تھا۔ ہمراہی اور ہم خیالی۔ اور اب ہم وطنی کے رشتے استوار تھے۔

"یار! میں کہتا ہوں، وہ وہم تھا۔ بھول جا اسے۔" سب کچھ سن کر وہ لاپروائی سے بولا۔

Faiz & HAZ AHMED
FaizKorean.com

"نہیں۔ وہم نہیں تھا۔ جم میں اس وقت بھی اس خواب کے اثر میں ہوں۔ اس آواز نے میرے ذہن کے دریچے کھول دیے ہیں۔ میرے لہو کی گردش میں بھی وہی آواز شامل ہے۔"

"تو اب کیا چاہتے ہو؟" جم لونہی میز پر لکیریں بنانے لگا۔

"تم۔ تمہاری بہت جان پہچان ہے۔ تم کسی طرح معلوم کرا سکتے ہو۔ وہاں گاؤں میں میرے ابا اماں کس حال میں ہیں۔ ان کی صحت کیسی ہے۔ اور گزر اوقات۔"

وہ رک گئے۔ ندامت نے سر جھکا دیا۔

"میں کہتا ہوں، وہم نہ کرو۔ سب اچھے ہوں گے۔" پتا نہیں جمی انہیں کیوں ٹالنا چاہتا تھا۔

"وہم۔ نہیں۔ وہم نہیں ہے۔ معلوم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آخر۔ آخر۔"

"آخر وہ تمہارے کوئی تو ہیں نا۔ اسی لیے۔" وہ طنز پر اتر آیا۔ "مگر اب دس سال کے بعد؟"

"ہاں۔" مجرمانہ سرگوشی میں انہوں نے کہا۔

"کیا کہیں گے وہ۔ دس سال بعد۔ وہ شاید تم کو صبر بھی کر چکے ہوں گے۔ تم نے شاید انہیں اپنا پتا بھی نہیں لکھا کہ وہ کبھی خط ہی لکھ کر معلوم کر لیتے۔ مگر ان کا تو وہی پتا تھا۔ اور وہ تمہیں خوب معلوم تھا۔ تم نے کبھی ان کو خیر چھوڑو وہ کچھ چٹھی نہ لکھی۔"

"ہاں میں مجرم ہوں۔" وہ بلند آواز میں بول اٹھے۔ "مگر قابلِ معافی ہوں۔ تم تو جانتے ہو ہم نے کس طرح شادی کی تھی اور پوشیدہ طور پر میں جنت کو لایا تھا۔ جنت کے والدین راضی ہی نہیں ہوتے تھے۔ کس مشکل سے۔ اچھا تم بتاؤ نا۔"

"تم بتاؤ۔ میں کس ذریعے سے معلوم کراؤں۔ کیا تم نہیں کرا سکتے؟"

"کسی بھی طرح۔ پلیز جم۔ میں نہیں چاہتا کہ اس معاملے میں میرا نام آئے۔"

"تم نہیں چاہتے کہ تمہارا پتا ان لوگوں کو ہو۔ ہے نا۔ یعنی تم اپنے بوڑھے والدین کو زندہ رہنے کا بھی حق نہیں دینا چاہتے۔ تمہاری خیریت کی خبر انہیں جینے کے موقعے دے سکتی ہے۔"

وہ طنز سے پھنکارنے لگا۔

"یار مجھے یہ بتا دو کہ تم ماں باپ کی زندگی کی خبر چاہتے ہو۔ یا موت کی۔ جیسے وہ تمہیں صبر کر چکے ہیں۔ تم بھی کیوں نہیں کر لیتے۔"

"میں بہت پریشان ہوں جمشید۔" وہ ماتھا رگڑنے لگے۔ "جانے کیا ہوا۔ رات میں نے ایسا خواب کیوں دیکھا۔ اتنے برسوں میں تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں نے دادا کو دیکھا وہ ہل کندھوں پر اٹھائے کھیتوں کی جانب جا رہے ہیں اور ابا۔ مجھے مار رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ تو اتنا بے غیرت ہے کہ دادا تو کندھے پر ہل اٹھا کر لے جا رہے ہیں اور تو۔ کھیل میں مست ہے۔ انہوں نے مجھے بہت مارا۔ میں۔"

"جس طرح بچپن میں وہ تمہیں مارتے تھے۔ اور تم اماں کو مدد کے لیے پکارتے تھے، خواب میں بھی یہ واقعہ عین اسی طرح پیش آیا۔" جمشید ہاتھ ہلا کر بولا۔ "یار یہ خواب لاشعور میں لمبی خواہشات کا عکس ہوتے ہیں۔ مان لو۔ کچھ نہیں ہوا۔ سب خیریت ہوگی۔"

"خدا کرے۔ مگر میرے یار۔ کسی طرح تمہیں میرا کام کرنا ہوگا۔ کسی طرح بھی۔" وہ منت سماجت پر اتر آئے۔

"اچھا دوست! کریں گے۔ کیوں نہیں کریں گے۔" وہ اٹھ گیا جانے لگا جاتے جاتے مڑ کر جیسے کوئی بات یاد آنے پر رک گیا۔ "ارے ہاں۔ وہ فرزند علی کا بھی کچھ پتا چلا۔ میں تو بھول ہی گیا۔ ہاں اس کی والدہ اب کہاں ہیں؟"

"وہ۔ سرفراز کے ساتھ ہیں۔ میں فرزند علی کا معلوم کروں گا ابھی وقت ہی نہیں ملا سمجھے۔ کل۔ کل ہی تو۔"

"یار! کمال ہے۔ دفتر سے گھر۔ گھر سے دفتر۔ کتنے گھنٹے گزر گئے ہیں۔ تم کو۔ وقت کی قیمت کا کب اندازہ ہوگا یار۔ گھر سے ہی فون کر لیتے۔ کسی پاکستانی سے رابطہ رکھتے۔ ایک سے دوسرا۔ دوسرے سے تیسرا۔ اسی طرح سفر طے ہوتا ہے۔ پھر معلومات ہوتی ہیں۔"

"ہاں۔ بس۔ کل بہت تھک گیا تھا۔"

"یہ تمہاری بیوی تمہیں عیاش بنا کر چھوڑے گی بیدی میاں، کبھی دل سے یہ بات نہ فراموش کرنا۔ کہ تم ایک کسان ہو۔ کسان کے بیٹے۔ کسان کے پوتے۔ محنت کش۔ زمین سے اپنا حق لینے والے۔ نہ تم حق لیتے ہو۔ نہ دیتے ہو۔ یہ آثار بہت خطرناک ہیں۔"

"شرمندہ نہ کریار! اچھا فرزند علی ملے تو اس سے کیا کہوں۔"

"کہنا کیا ہے۔ اسے فوراً بلاؤ۔ اس کے بعد اس کی ماں سے ملاقات کراؤ۔ اسے اپنا کام سمجھ کر کرنا ہے۔ جیسے وہ فرزند علی کی ہی نہیں۔ تمہاری بھی ماں ہو۔ سمجھے۔"

جمشید کے لہجے اور آواز میں تلخی تھی، چبھن تھی۔ جو ان کے دل میں جا کر چبھ گئی۔

فرزند علی کی ماں، وہ بوڑھی عورت کل آئی تھی۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر غم والم کی داستان رقم تھی۔ اس کی آنکھوں میں سمندر چھپا ہوا تھا۔ وہ آنسوؤں کی چمک میں بہتے ہوئے دکھوں کے راز آشکار کر رہی تھی۔ فرزند علی چھ سات سال پہلے انگلینڈ آیا تھا۔ کافی دن تو اسے کوئی نوکری نہ ملی۔ وہ ایک دوست کے پاس مقیم تھا۔ اور چھوٹے موٹے کام کرتا رہا۔ پھر اسے مناسب ملازمت مل گئی۔ اس نے ماں کو بڑے جوش میں لکھا۔ "اب دکھ کے دن گزر گئے ہیں۔ اگلے مہینے پابندی سے تجھے پیسے بھیجوں گا۔ اس رقم سے بچت کر کے گھر کی حالت درست کرانا۔ بیوہ بہن کو الگ رقم بھیجوں گا۔ بھانجے کو اچھے اسکول میں داخل کرانا۔ تو بے فکر ہو جا ماں۔ ہمارے اچھے دن آ گئے ہیں۔"

مگر اچھے دنوں کے انتظار نے بوڑھی ماں کو مزید بوڑھا کر دیا۔ دو تین وعدہ کے بعد پھر اس نے ماں کو رقم بھی نہیں بھیجی۔ ہر خط میں انگلینڈ کی مہنگی زندگی کا رونا روتا رہا۔ پھر معلوم ہوا کہ اس نے ایک انگریز عورت سے شادی کر لی۔ اور شادی کے بعد اس کے خط بھی کم ہوتے گئے۔ جو خط آتا اس میں خرچ پورا نہ ہونے کے بھڑے ہوتے۔

ماں نے اسے لکھوایا کہ یہاں واپس آ جا۔ ہمیں تیری بیوی پسند آ گئی ہے۔ دراصل اس کی تصویر جو فرزند نے بھیجی تھی ماں کو اچھی لگی۔ گوری چٹی نیلی آنکھیں۔ لمبی کے بالوں کی رنگت کے بال۔ سفید جھک فراک پہنے۔ سر پر سفید موتیوں کا تاج۔ شادی کی تصویر میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ماں نے بار بار لکھا کہ تھوڑی سی زمین ہمارے پاس ہے۔ اگر اسے سنبھال، کاشت کاری کر۔ جیسے تیرے باپ دادا کرتے رہے۔ اگر تو اس زمین میں ہل چلاتا، تھوڑی محنت کرتا تو ہماری اچھی گزر بسر ہو جاتی۔ روٹی کی تو ہمیں کبھی تنگی نہ ہوئی اللہ کی مہربانی۔ واپس آ جا۔ سب مل جل کر محنت کر کے زیادہ کمائی کر لیں گے۔ تیرے دور جانے کا فائدہ بھی نہیں ہوا۔ ادھر تو تنگی ہیں، ادھر تم مفلسی کے بھنور میں گرفتار۔ زمین تیری منتظر ہے۔ کون ہے جو اس کی اجڑی مانگ بھرے اور سونی کوکھ آباد کرے۔"

مگر فرزند علی نے جواب نہ دیا۔ اس کے بار بار خط بھیجنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب فرزند علی کے خط بالکل بند ہو گئے تھے۔ آخری خط میں ماں نے لکھا۔

"تو بس اپنی خیریت ہی لکھ دیا کر۔ ہمیں تیرے پیسوں کی ضرورت نہیں۔ تیرا بھانجا اب ہل اٹھانے کے قابل ہو گیا ہے۔ اور اللہ کی مہربانی سے ہم بھوکے نہیں سوتے۔"

اس خط کا جواب بھی نہیں آیا۔ تو ماں کے دن تڑپ تڑپ کر اور رات انگاروں پر بسر ہونے لگی۔ جانے یہ مامتا کا جذبہ اتنا شدید کیوں ہوتا ہے۔ اور ماں بیٹے کا رشتہ اتنا گہرا کیوں ہوتا ہے۔ مرنے دیتا ہے نہ جینے۔ یہ جدائی، یہ دوری ماں کو تو جہنم کی یاد دلا دیتی ہے جبکہ سنتے ہیں کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔

ماں اپنی پتا سنا رہی تھی اور خون کے آنسو رو رہی تھی۔ سامیوال کے رہنے والے انگلینڈ آ رہے تھے کسی نے فرزند کی ماں کو بتایا۔ اس نے ان سے بھی منت سماجت کی کہ فرزند علی کی کھوج لگائیں۔ اور انہیں اس کی خیریت لکھیں۔ وعدے کے مطابق ان صاحب نے خط بھیجا مگر اس میں انہوں نے اس کی خیریت تو نہیں لکھی۔ بس اتنا لکھا۔

"تم فرزند علی کو بھول جاؤ چاچی اب وہ تمہارا نہیں رہا۔ وہ گاؤں کے حوالے سے بھی شرمانے لگا ہے۔ اور کسی کو بھی پہچاننے سے انکاری ہے۔"

تب سے ماں بن پانی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ آخر کار بہت سوچ کر اس نے خود انگلینڈ جا کر بیٹے سے ملنے کی ٹھانی۔ سرفراز فرزند علی کے کسی عزیز کا رشتے دار تھا۔ وہ لندن میں رہتا تھا۔ شادی کرتے وطن گیا ہوا تھا۔ فرزند کی ماں نے اس سے رابطہ قائم کیا۔ سرفراز نے بتایا کہ وہ فرزند کے ٹھکانے سے واقف نہیں مگر اس کا پتا چلانا مشکل نہ ہوگا۔ شادی کے بعد سرفراز بیوی کو لے کر لندن آیا۔ تو فرزند علی کی ماں بھی اس کے ساتھ آ گئی۔ اور تب سے وہ سب فرزند کو تلاش کر رہے تھے۔

Scan & PDF FIAZ AHMED Friend Korner.com

جمشید اپنے حلقے میں بہت مشہور تھا۔ سرفراز اس سے ملا۔ اور ماں کو بھی ملا دیا۔ معلومات کرنے پر پتا چلا کہ فرزند بریڈ فورڈ میں رہتا ہے اور بیدار بخت کسی کمپنی کی بریڈ فورڈ والی شاخ میں کام کرتا ہے۔ جمشید ان کے پاس ماں کو لایا تھا اور فرزند کی تلاش کا کام انہیں سونپ دیا گیا تھا۔ انہیں کل کی وہ ملاقات خوب یاد تھی۔

جھریوں بھرے چہرے پر آنسوؤں کی قطاریں۔ لڑکھڑاتی زبان پر دعائے خیر کے ساتھ فرزند کا ذکر۔ وہ اس ماں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے اس سے وعدہ کیا کہ آج ہی فون کر کے اس کی خبر لیں گے۔ اور جمشید کو بتا دیں گے۔ جمشید اسی امید میں فوراً ہی بھاگا بھاگا آیا تھا۔ مگر یہاں فرزند علی نہیں بیدی کو خود اپنی الجھنوں میں گرفتار پایا تھا۔

خواب کسی آفت ناگہانی کی طرح ان پر مسلط تھا۔ ماں کو پکارنا۔ بھولی بسری یادوں کا شعور پر حملہ آور ہو کر ذہن کو جھنجھوڑ دینا۔ جمشید انہیں دلاسا دے کر چلا گیا اور وہ سر کو ہتھیلی سے دبائے پُرسکون ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

خجستہ کا فون آیا۔ "خیریت؟ طبیعت؟ ٹینشن تو نہیں؟ کام نہ کر سکو تو آ جاؤ۔ آرام کر لینا۔"

کام واقعی ان سے نہیں ہو رہا تھا۔ مگر آرام کا بھی ارادہ نہ تھا۔ ان کے ذہن کے پردوں پر ایک وجود اُبھر رہا تھا۔ جھریوں سے بھرا بوڑھا چہرہ۔ آنسوؤں میں بھیگا ہوا۔ آہوں میں جکڑا ایک بوڑھی عورت کا وجود۔ ماں کا وجود۔

"فرزند علی نے تو تمہیں رقم بھیجنا بند کر دی تھی۔ پھر تم نے کرائے کا، لندن تک کا انتظام کیسے کیا؟ قرض لے کر؟" وہ اس ماں سے جرح کر رہے تھے جو سامنے ہوتی تو آ فی تھی۔ "مجھے کون قرض دیتا بیٹے۔؟"

"پھر۔ تم نے کرائے کا بندوبست کیسے کیا؟"

"ہم لوگ کہاں سے پیسے لے سکتے ہیں؟ زمین ہی ہمارا سہارا۔ زمین ہی آسرا۔"

"اچھا۔ اچھا۔ تو زمین سے خوب آمدنی ہوتی تھی۔ تمہارا فوسا جوان ہو گیا ہو گا۔ ہے نا؟" انہوں نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ محنت تو بہت کرتا ہے۔ پر ہے ابھی بچہ۔ تگڑا گبھرو تو نہیں ہوا۔ اصل میں، میں نے زمین بیچ کر کرایہ دیا۔"

ماں نے سر جھکا لیا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ میں مجرم ہوں، میں نے زمین کا، اپنی ماں کا سودا کیا۔ مگر بیٹے کی دید کا شوق۔ میں خود کو بیچ کر بھی پورا کر سکتی ہوں۔

"تم بھی کسی کے بیٹے ہو۔ تمہیں معلوم ہو گا۔ ماں کی ممتا کتنی اندھی ہوتی ہے۔ نہ میں نے بیوہ بیٹی کی فکر کی، نہ معصوم نواسے کا لحاظ۔ بیٹے کی تلاش میں اتنا لمبا سفر کر کے آ گئی۔ اسے زندہ سلامت دیکھ لوں۔ اس کے ماتھے پر پیار کر لوں۔ تو سمجھ لوں گی۔ میری یہ خود غرضی راگاں نہیں ہوئی۔" وہ اب سسکیاں لے رہی تھی۔

"تو پھر اب واپس جا کر کیا کرو گی؟ زمین بھی تم نے بیچ دی تو کھاؤ گی کہاں سے؟"

"مزدوری کر لوں گی۔ اپنے ہی کھیتوں میں۔"

"تم۔ تم کیا مزدوری کر سکو گی؟ اتنی کمزور اور بوڑھی ہو۔ تمہاری عمر اب آرام کرنے کی ہے۔"

وہ بے چینی سے بول اٹھے۔ اس بوڑھی عورت کو مزدوری کرتے دیکھنا بہت بڑی سزا تھی۔

"یہ۔ بات تو بیٹوں کے سوچنے کی ہوتی ہے۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔ ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ میرے بیٹے کو اتنی فکر ہوتی تو میں یہ کام ہی کیوں کرتی۔ زندگی کا بھروسا نہیں۔ سوچا کہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ تو اسے دیکھ لوں چھ سات سال ہو گئے ہیں۔ مرنے والوں کو صبر کر لیا جاتا ہے۔ پر زندہ ــــ کے لیے تو تڑپ بڑھتی رہتی ہے۔"

انہیں اس ملاقات کی ایک ایک بات یاد تھی۔ اس بوڑھی عورت کے الفاظ نے، اس کے ممتا سے بھرے لہجے اس کی تڑپ نے انہیں بھی کئی بار مضطرب کیا تھا۔ کئی بار انہیں محسوس ہوا۔ جیسے وہ خود ان پر طنز کر رہی ہے ان کے ضمیر کو کچوکے لگا رہی ہے بیٹے پر رکھ کر انہیں شرما رہی ہے۔

وہ بوڑھی عورت جو کسی فرزند علی کی ماں تھی۔ وہ ان کی ماں بھی ہو سکتی تھی۔ وہ بھی تو دس سال سے ماں سے دور ہیں۔ ماں، باپ جنہیں اپنے اکلوتے بیٹے کی کوئی خبر نہیں۔ انہوں نے کبھی ماں باپ کو خط نہیں لکھا۔ تو اب یہ طے ہے کہ اس بوڑھی ماں نے ان کے اپنے شعور میں سوئے ہوئے بیٹے کو گہری نیند سے بیدار کر دیا۔ خواب اسی بیداری کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ ماں۔ ماں تم کیسی ہو۔ ابا تم کہاں ہو۔ تم نے مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ پر۔ تم خود کیوں نہیں دادا کا بوجھ ہلکا کرنے کو آگے بڑھے۔ کیا۔ کیا تم موجود نہیں ہو۔ دنیا میں۔ موجود تو دادا بھی نہیں ہیں مگر خواب میں ہی نے اماں کو ہی کیوں پکارا۔ دادا یا چچا کی مدد کیوں نہ مانگی۔

وہ گہری جذباتی کڑکتی آواز۔ اماں ں ں۔ جیسے شعور میں، وجود میں کھلبلی سی مچ جائے۔ یہ اس ماں کا کارنامہ ہی تو نہیں۔ جو اپنے بیٹے کو دیکھنے کی تڑپ میں اپنی زمین بیچ کر آ گئی ہے۔ میری ماں کے پاس تو اب زمین بھی نہیں ہے۔ اس کے پاس میرا پتا بھی نہیں ہے۔ فرزند علی انگلینڈ میں ہے اس کی ماں کو اتنا تو علم ہے۔

انہوں نے تو کراچی سے خط لکھا تھا۔ اطلاع ــــ دی تھی۔ "اماں! میں اپنی پسند کی شادی کر رہا ہوں۔ مجھے تمہاری بھاجی اچھی نہیں لگتی میں اس کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا۔ اب مجھے ایک پڑھی لکھی شہری لڑکی مل گئی ہے۔ بہت خوبصورت ہے اماں! میرے لیے دعا کرنا۔

تمہارا تابعدار بیٹا!

بیدار بخت

شادی کے بعد کافی پریشانی میں وقت گزرا۔ پھر وہ خجستہ کو لے کر انگلینڈ آ گئے۔ ان کی ملازمت کا بندوبست وہاں ہو چکا تھا۔ اس لیے کچھ عرصے کے بعد وہ بے فکر ہو گئے۔ اماں، ابا کو۔ گاؤں کو بھلا دیا۔ خجستہ کا حسن، اس کی ادائیں، اس کا نکھتا وجود۔ اس کی خدمتیں۔ ناز و انداز اور اس کی قربت میں سکون و آسودگی کا بے پایاں احساس۔ پھر بچوں کی آمد۔ اور مزید مسرتوں کا اہتمام۔ خوشحالی۔

"فرزند کی ماں۔ تم کہاں آ گئیں۔ آہی گئی تھیں تو اپنے بیٹے کو تلاش کرتیں۔ تم نے مجھے کیوں تلاش کر لیا۔ مجھے کیوں بے سکون کر دیا۔" بھولی بسری ساری باتیں، تمام رشتے تواتر سے ذہن میں آ دھمکتے۔ اور وہ مسلسل بے چین ہوتے رہے۔

کئی دن بعد فرزند کی ماں جمشید کے ساتھ ان کے دفتر آئی۔ فرزند ساتھ تھا۔ وہ انہیں سائیڈ روم میں لے گئے۔ ماں کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ تھا۔ جس چہرے پر چند دن پہلے آنسوؤں کی قطاریں تھیں۔ آج وہ خوشی سے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ ان کا شکریہ ادا کرتے نہ تھک رہی تھی۔ کہ انہی نے بریڈ فورڈ آفس فون کر کے فرزند کو فوراً بلایا تھا۔ اور پھر جمشید سے ملوایا تھا۔

"بہو سے کیسے گزارا کرو گی اماں۔ وہ تو میم ہے۔" وہ مذاق کرنے لگے۔

"میں تو کر لیتی۔ اگر وہ پاکستان آتی۔ لیکن۔" وہ تشویش بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟"

"وہ۔ وہ تو۔ اسے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ کہتی ہے تمہاری ماں سے پیچھا نہیں چھوٹ سکتا۔ یہ تو یہاں بھی آ گئی۔ میں تو اپنی پھپھی والی گوری ساس کو برداشت نہیں کر سکی اور اس پہلے مرد سے طلاق لے کر آ گئی تھی۔ یہ تو کالی بھی ہے اور پھر بھی آ سکتی ہے۔ لے بھلا اب میرے پاس کوئی زمین دھری ہے جسے بیچ کر پھر آؤں گی۔ پر اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ اب اور مشکل۔ وہ تو چلی جائے گی۔ اور میرا بیٹا خرچہ دیتا رہے گا۔"

ماں بہت فکرمند ہو گئی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد جمشید اپنی کوششوں کا ماحصل بتانے لگا۔ اس نے سیالکوٹ اپنے ایک کزن کو فون کر دیا تھا۔ وہ کزن ان کے گاؤں جا کر تفصیل معلوم کر کے جمشید کو بتائے گا۔ شاید دو تین دن تک کچھ پتا چلے۔ یہ بھی بہت تھا۔ وہ خود تو اتنا بھی نہیں کر سکے تھے کئی دن اضطرابی کیفیت میں گزارے۔

خجستہ شوہر کی بدلتی ہوئی کیفیت سے ہراساں ہو رہی تھی۔ شادی کو اتنا عرصہ گزر گیا تھا۔ کبھی وہ اتنے پریشان نہیں ہوئے تھے۔ شروع شروع میں وہ اپنے اماں ابا کو یاد ضرور کرتے تھے۔ ان کا ذکر کرتے۔ اپنے گاؤں کی ہریالی پہاڑی راستے۔ دریائے سیدا کا سرد، یخ بستہ پانی۔ اس کی تیز روانی کا تذکرہ۔ اونچے پیڑوں کی آسمان کو

Scan & Post
FIAZ AHMED
Friends Korner.com

چھوٹی شاخوں کو یاد کرتے۔ جنگل کی مخصوص مہک بھی انہیں یاد آتی۔ مگر پھر۔

رفتہ رفتہ وہ لندن کی فضاؤں کے عادی ہوتے گئے۔ خجستہ کے حسن میں کھو گئے۔ پہلے کرائے کے اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ اب دو سال سے یہ مکان خرید لیا تھا۔ خجستہ خوش تھی کہ وہ اس کے عشق میں گرفتار تھے۔ انہیں وہی کام تھے خجستہ کو خوش رکھنا۔ اور دولت کمانا۔ ماں باپ کو تو بھول چکے تھے۔ پھر گاؤں کی زندگی میں تھا ہی کیا۔ یہاں انہیں ترقی ملی تھی، دولت، شہرت، عزت گاؤں میں ان جیسے بہت تھے۔

خجستہ کو کیا معلوم۔ ادھر کئی سال سے تو وہ مجرمانہ احساس کے تلے دبے ہوئے تھے۔ شادی کی خبر دے کر چپ سادھ لینا۔ لندن آکر انہیں خبر نہ دینا۔ حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے مصروفیت بڑھتی گئی۔ وہ دن رات پیسہ کمانے میں لگے رہتے

پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب انہیں شدت سے والدین یاد آئے۔ اپنی زمین یاد آئی۔ گاؤں کی گلیاں۔ دوست۔ رشتے دار۔ مگر ان دنوں خجستہ کی جنتیں والہانہ پن زیادہ ہی ترقی کر رہی تھیں۔ وہ سوچتے کہ شادی کر کے اگر یہاں آنے کے بجائے گاؤں چلے گئے ہوتے۔ اماں ابا اس حسین بہ مہ جبیں بہو کو پا کر خوش ہو جاتے۔ اس کے بعد وہ لندن بھی آجاتے تو اتنا افسوس نہ ہوتا۔

خجستہ انہیں تسلی دیتی "کیا ہوا۔ جو ہوا اچھا ہوا۔ گاؤں میں یہ آسائشیں یہ عیش و عشرت کہاں؟"

مگر۔ آج انہیں اس خسارے کا احساس ہو رہا تھا جو والدین کو بے خبر رکھ کر ہوا۔ وہ کس قدر تہی دامنی کے شکار تھے۔ بے بسی کے اسیر۔ سونے کے لیے لیٹتے تو بے چینی بڑھ جاتی۔

خجستہ کی تمام تر قاتل ادائیں والہانہ سپردگی بیکار جا رہی تھی۔ وہ بیزار ہو جاتے۔

"میرا موڈ ٹھیک نہیں" وہ بے دردی سے اس کا بازو جھٹک دیتے "نیند آرہی ہے"

یہ بہانہ بھی خوب تھا۔ خجستہ بھی خوب جانتی تھی انہیں نیند نہ آنے کا روگ لگ گیا ہے۔

اس رات بھی یہی ہوا۔ وہ ان کی بے نیازی پر یکتائی کی سی کیفیت میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ تبھی فون گنگنانے لگا۔ ریسیور کان سے لگائے وہ جمی کی آواز سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"بس تم فوراً آجاؤ" جمشید کہہ رہا تھا۔

"مگر کیوں؟ بتاؤ تو نا"

"کہہ رہا ہوں کہ فوراً آجاؤ۔ تمہارے گاؤں سے کچھ خبر ملی ہے"

"تو بتا دو نا یار۔ کیوں ستاتے ہو" وہ چلائے مگر جمی نے فون بند کر دیا تھا۔

عجلت میں اٹھ کر کوٹ پہنا۔ برساتی اٹھائی۔

"کچھ موسم کی بھی خبر ہے" خجستہ نے یاد دلایا "ریڈیو نے رات بھر برفباری کی خبر دی ہے۔ صبح کا انتظار نہیں کر سکتے۔؟"

"نہیں۔ بہت انتظار کر چکا۔ اب نہیں۔ تم دروازہ بند کر کے سو جانا۔ اگر موسم خراب ہوا تو میں صبح ہی واپس آؤں گا"

"کہاں جا رہے ہیں؟ یہ تو بتا دیں۔ تاکہ میں فون کر کے خیریت تو پوچھ لوں"

"ضرورت نہیں ہے۔ میں خود آجاؤں گا"

رازداری کی انتہا کر دی تھی۔ خجستہ جھنجھلا کر رہ گئی۔ دروازہ زور سے بند کر کے کمرے میں آئی۔ غصے میں رونا آنے لگا۔

صبح وہ ایک بہت اچھی رومانی، جذباتی قسم کی فلم لائی تھی سوچا تھا رات میں دونوں فلم دیکھیں گے۔ وہ ٹی وی لگا کر بستر پر لیٹ گئی۔ آنکھوں پر بازو رکھ کر رونے لگی۔ فلم چلتی رہی خجستہ کا خون جلتا رہا۔

برفباری شروع ہو گئی تھی۔ جمشید کا گھر بہت دور نہ تھا۔ وہ پندرہ منٹ میں پہنچ گئے۔ رات برفباری بڑھ گئی۔ صبح وہ بچوں کے ساتھ ناشتا کر رہی تھی۔ تو وہ تھکے ہوئے گھر میں آئے اور سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بے خوابی، اضمحلال، تھکن ان کے ہر قدم سے ظاہر ہو رہی تھی۔ غصہ خجستہ کو بھی تھا۔ گلہ بھی۔ شکایت بھی۔ مگر ابھی تک وہ معاملے سے بے خبر تھی۔ اس لیے اپنی انا کو نظر انداز کر کے ان کے پاس ہی چلی گئی اور ان سے پریشانی کا سبب پوچھنے لگی۔

"خجستہ! ہم پاکستان واپس جا رہے ہیں" انہوں نے کہا۔ شاید بم پھٹنا تب بھی اتنا صدمہ اسے نہ ہوتا۔

"کیوں؟" وہ چیخی۔

"بس، میں نے فیصلہ کر لیا ہے"

"مگر کس لیے۔ مجھے تو بتانے، ہوا کیا ہے؟"

"تم نے پہلے تو کبھی کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ جب ہم نے خفیہ شادی کی۔ پھر یہاں آئے۔ جب یہیں سیٹل ہونے کا طے کیا، جب یہ گھر خریدا۔ تم نے تو کبھی پوچھا نہیں تھا"

"اس لیے کہ وہ سب۔ اس میں میری مرضی شامل تھی۔ ہمارے لیے یہ سب ضروری تھا"

"تو اب سن لو۔ کہ میرے لیے پاکستان جانا بے حد ضروری ہے۔ اور ہم مستقل جا رہے ہیں"

دو ٹوک فیصلہ سنا کر وہ پلنگ پر کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔

"دفتر نہیں جائیں گے؟"

آخر کار غم و غصے پر مصلحت کی چادر ڈال کر فرض ادا کرنے کی ٹھان لی۔ ابھی اسی وقت تو نہیں جا رہے۔ میں روک لوں گی۔ وہی نرم لہجہ میٹھی آواز جو انہیں اپنا اسیر بنا لیتی تھی۔ لیکن آج تو موڈ ہی دوسرا تھا۔ وہ اس کی اسیری سے بچنا چاہتے تھے۔

"جاؤں گا۔ ابھی جاتا ہوں" وہ اٹھ گئے۔

خجستہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ بستر سے ٹکرائے۔

کراچی ایئرپورٹ خوابوں کے جزیرے کی مانند جگمگا رہا تھا۔ روشنیوں کے پس منظر میں صبح صادق کے دھندلکے اور دور افق پر سرمئی دھاری کے ساتھ گلابی لکیریں۔ کہیں کہیں اڑتے سفید آوارہ بادل ٹھنڈی ہوائیں۔ جو جسم میں سرشاری سی پیدا کر رہی تھیں۔ بڑی مقدس صبح تھی۔ صبح کا بھولا صبح کو لوٹ آیا تھا۔

انگلینڈ روانہ ہوتے وقت بھی وہ اداس نہ تھے خوش تھے۔ آرزوؤں کی تکمیل کی امید پیدا ہونے پر۔ خجستہ۔ ان کی محبت کے حاصل ہونے پر۔ اور آج واپسی میں بھی وہ خوش تھے۔ وطن کی مٹی نے بالآخر انہیں بلا لیا تھا۔ مادر وطن کی فضائیں امیدوں کی دنیا آباد تھی۔

مگر خجستہ کا موڈ بہت خراب تھا۔ جاتے وقت وہ بے حد مسرور تھی۔ اپنی محبت کی کامیابی اور زندگی کے حسین سفر کی ابتدا، چمکتی دمکتی دنیا اس کی منتظر تھی۔ وہ دنیا۔ جو اس کا خواب تھی۔ ہوائی سفر۔ لندن، مانچسٹر، برمنگھم اور بیدار بخت کی ہمراہی۔

خجستہ کے والدین بیدار بخت سے اس کی شادی کے خلاف تھے۔ انہوں نے اپنی مرضی سے یہ شادی راحیہ پرویز کے گھر کی تھی۔ پہلے انہوں نے بہت کوشش کی کہ خجستہ کے والدین مان جائیں۔ مگر دونوں اکھڑے رہے۔ ابا نے اس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے سے طے کر دی تھی۔ امی نے بھتیجے سے۔ ایسے میں خجستہ بار بار امی سے کہتی۔ کہ ابا اپنی ضد پر اڑے رہے اور آپ بھی۔ تو ان دونوں سے تو اس کی شادی ہو نہیں سکتی۔ اگر تیسری جگہ اس کا مقدر پھوڑنا ہے۔ تو پھر بیدی اس کی پسند ہے۔ اس کی محبت ہے۔ راحیہ پرویز کی بہن کی شادی میں دونوں ملے تھے۔ خجستہ کی وہ سہیلی تھی۔ راحیہ پرویز بیدی کا دوست تھا۔ محبت فوراً نہیں ہوئی۔

مگر چند ملاقاتوں میں جب خجستہ کو علم ہوا کہ بیدار بخت انگلینڈ جانے والا ہے۔ جہاں اس کے لیے ملازمت کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔ اسے یہ نوجوان جو شکل صورت کے لحاظ سے پسند تھا۔ اب وہ اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ خجستہ کا حسن، شوخ ادائیں، دلبرانہ انداز، بیدی کو اچھا لگا۔ اسے تیز چلبلی لڑکیاں پسند تھیں۔ وہاں گاؤں میں ایک سے بڑھ کر ایک بدھو۔ لونگی اور اوٹ پٹانگ لڑکیاں تھیں۔ انہی میں سے کسی سے اماں نے اس کی منگنی بھی کر دی تھی۔ مگر اسے خجستہ بھا گئی۔

چند اور ملاقاتوں میں دونوں کی آنکھوں میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آنے لگا۔ پرویز نے بھی کوشش کی کہ شرافت سے شادی ہو جائے مگر خجستہ کے باپ نے اسے انا کا سوال بنا لیا۔ پھر پرویز کی تجویز پر ان کی خفیہ طور پر شادی ہوئی۔ کئی ماہ بعد خجستہ کے والدین کو اطلاع ہوئی۔ انہوں نے بڑا واویلا مچایا۔ خجستہ کی خوب پٹائی کی گئی۔

پھر پرویز جو وکیل تھا اس نے دھمکی دی کہ ایک بالغ شادی شدہ لڑکی پر حملہ اور زدوکوب کرنے

Scan & PDF FIAZ AHMED Friends Korner.com

کے الزام میں عدالتی کارروائی ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ ڈر گئے۔ انہوں نے خجستہ کو تین کپڑوں میں گھر سے نکال دیا۔ چلتے ہوئے امی نے اس کے کانوں سے سونے کی بالیاں بھی اتار لیں اور کہہ دیا۔

"آج سے ہم تمہارے مر گئے اور تم ہمارے لیے!"

خجستہ خوش تھی۔ اسے بدنامی کی یا ماں باپ کی ناراضگی کی پروا نہ تھی۔ دل کی مراد بر آئی تھی۔ یہی اس کے لیے سرمایۂ مسرت بن گیا۔ اتنے سال بعد کراچی ایئرپورٹ پر انہیں — خوش آمدید کہنے والوں میں کوئی رشتے دار نہ تھا صرف آپریٹرز ہی آیا تھا۔ انہیں اسی کے گھر قیام کرنا تھا۔ اس کی فیملی پشاور گئی ہوئی تھی۔ گھر بالکل خالی تھا۔ انہیں تکلیف نہیں ہوئی۔

پھر دو تین دن میں پرویز نے ایک اچھا خوبصورت سا مکان بھی کرائے پر حاصل کر لیا اور وہ ایک سال کا کرایہ ادا کر کے پرویز کے گھر سے اس گھر میں آ گئے۔ فی الحال تو جو سامان وہ ساتھ لائے تھے اسی سے گزارا کرنا تھا۔ باقی سامان تو شپ پر آ رہا تھا۔ اس میں دیر تھی۔ پرویز دو پلنگ اور قالین اپنے گھر سے لے آیا۔

بیدی کے ذہن سے بوجھ ہلکا ہو چکا تھا مگر خجستہ کی اداسی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ جسمانی طور پر آ گئی تھی مگر اس کا دل اور روح لندن ہی میں تھی۔ اس کی اداسی دیکھ کر بیدی نے اسے والدین سے ملاقات کرنے کی اجازت دے دی مگر خجستہ کو اس بات پر بھی خوشی نہیں ہوئی۔

وہ جانتے تھے خجستہ کے لیے انگلینڈ سے واپسی اذیت ناک مرحلہ ہے۔ وہ اسے سمجھاتے، بہلاتے۔ مادرِ وطن کی ہواؤں، فضاؤں کی اہمیت۔ انسیت سے آگاہ کرتے۔ مگر وہ بیزار تھی۔ یہاں کیا ملے گا؟ یہ سوال اس کے لیے جان لیوا تھا۔ اسے چمکتی دمکتی زندگی پسند تھی۔ لندن پسند تھا۔ وہاں محنت کا صحیح صلہ تو ملتا تھا۔ وہ اب کم آمدنی میں گزارا کرنے پر تیار نہ تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا۔

"اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی۔ کوئی غم تھا نہ فکر۔ میں یہاں نہیں رہ سکوں گی۔"

"یہاں بھی اچھی گزر جائے گی۔ اپنوں میں۔ میں محنت کروں گا۔ ہر کام کر لوں گا مگر تمہیں تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"ہونہہ۔ اور ملے گا کیا؟"

"ماں تو ملے گی۔" وہ بے ساختہ کہہ گئے۔ اور خجستہ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔

تو یہ تھا لندن سے واپسی کا سبب۔ جس رات خواب میں اماں کو پکارا تھا اسی دن سے وہ گم صم سے ہو گئے تھے۔ تو اماں کے لیے آئے ہیں۔ اپنے بچوں کا تعلیمی مستقبل تباہ کر کے۔ اپنی زندگی اور میری خوشیاں برباد کرنے۔ میرے بچے اس گندے موسم اور خراب ماحول میں کیسے رہ سکیں گے۔ میں وہ شاندار زندگی کیسے بھلا پاؤں گی۔ منہ سے نکلا ہر حرف پورا ہوتا تھا۔

اب یہاں تو یہ ساس ہے اس کی فکر۔ یہ سسرال ہے اس کا ڈر۔

"میں بکنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ اگر تم اماں سے ملنا پسند کرو تو میں تمہاری سیٹ بھی بک کرا لوں۔" انہوں نے اس سے سوال کیا خجستہ بل کھا کر رہ گئی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ گاؤں کی گندی گلیاں۔ کیچڑ، گوبر۔ اُف میرے خدا۔ مجھے تو تمہاری فکر ہے۔ کیسے برداشت کرو گے۔"

"میری فکر نہ کرو۔ وہ میری اصل ہے۔ میری شناخت وہ گلیاں، وہ ہرے بھرے کھیت۔"

"ہرے بھرے کھیت جن پر تمہارا کوئی حق نہیں۔" وہ بھنا کر بولی۔

"اگر میں لندن نہ جاتا — تو کھیت بھی میرے ہوتے زمین بھی۔ میں اپنی زمین بیچنے پر مجبور ہو گیا تھا — لندن جانے کے لیے کرایہ بھی تو — تمہیں یاد نہیں — ؟"

"یاد ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "گئے تھے کہ مستقبل روشن کریں گے۔ اور آ گئے سب کچھ برباد کر کے۔"

خجستہ بہت تلخ ہو گئی تھی۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے ایک خوش اخلاقی کا۔ محبت اور خدمت کا ظاہری نقاب اوڑھا ہوا تھا جو کراچی آ کر اتار پھینکا۔ اس کے لہجے کی نرمی، آواز کی مٹھاس جانے کہاں چلی گئی تھی۔ لندن سے واپسی اس کے ارمانوں کا خون — وطن واپسی۔ وطن کی محبت۔ دوست۔ رشتے دار۔ عزیز و اقارب کوئی اس کے لیے خوشی کا موجب نہ تھے۔

وہ حیرانی سے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ خجستہ سے باتوں میں وہ وقت کا اندازہ نہ کر سکے۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد گھڑی دیکھی۔ انہیں یاد آیا بکنگ آفس تو چار بجے بند ہو جاتا ہے۔ اور اب چار بج

چکے تھے۔ انہوں نے ٹیکسی واپس مڑوالی۔ ڈرائیور کا موڈ نہ خراب ہو جائے اس لیے اسے کرایہ پورا ادا کر دیا۔ گھر کے لان میں دونوں بچے بدستور کھیل رہے تھے۔ گیٹ بند کر کے وہ اندر آئے۔

خجستہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ کسی شناسا لفظ پر وہ رک گئے۔ وہ کبھی یہ تجسس نہیں کرتے تھے کہ خجستہ کس کو فون کر رہی ہے یا کیا بات کر رہی ہے مگر اپنا ذکر سن کر غیر ارادی طور پر ٹھٹک گئے۔ کمرے کے باہر کھڑے ہو گئے۔

"ہاں۔ جا رہے ہیں اپنی اماں جان سے ملنے۔ پتا نہیں نہیں میں تو نہیں جاؤں گی۔ مجھے ان کی ماں یا اس گندے گاؤں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہوں کی ایسی ہی جیسی دیہاتی عورتیں ہوتی ہیں۔ چھوڑیں امی۔ یہ بتائیں میں نے دسمبر میں ریحانہ کے ہاتھ آپ کو شیشے کی رنگین ٹرے بھیجی تھی۔ گنگا جمنی۔ اس کے ساتھ کے گلاس ارشد کے ذریعے بھیجے تھے۔ مل گئے۔ شکر ہے آپ کو پسند آئے اور بابا کو اپنی چیزیں پسند آئیں۔؟"

"میں کل یا پرسوں آپ کے پاس آؤں گی۔"

"ہاں ہاں بیدی نے اجازت دے دی ہے۔ ہاں انہیں کیا خبر ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔"

"امی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں — ؟ اگر میں نے آپ لوگوں کی تڑپ کا احساس کر کے لندن سے ٹکٹ بھجوا دیے تو کوئی احسان تو نہیں کیا۔ شکر کرتی ہوں کہ اس بہانے آپ کی ناراضگی تو دور ہوئی۔ اب آپ لوگ بیدی سے ملنے آئیں۔ دعوت شاوت بھی کر دیں۔ ان کے گاؤں جانے سے پہلے۔ آخر داماد ہیں۔"

"امی! میں آپ کے لیے اور سب کے لیے ڈھیروں سامان لائی ہوں — روزی کے جہیز کے لیے ڈنر سیٹ — اور — سامان شپ سے آنے والا ہے۔ آپ حیران رہ جائیں گی اتنا قیمتی سامان لیا ہے آپ کے لیے۔"

"ہاں — نہیں نہیں۔ بیدی کو کیا خبر۔ میری اپنی چوائس میری اپنی شاپنگ ہے۔ میں کچھ خریدوں۔ پھینکوں۔ توڑوں انہیں زیادہ پروا نہیں ہوتی۔ اِس معاملے میں بڑی خوش قسمت ہوں۔"

"امی! اب آپ کو یقین آیا؟ بیدی سے شادی کا یہ فیصلہ غلط نہیں تھا۔ میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ ہے خاندان میں کوئی ایسا؟"

"ہاہاہا۔ خوب کہا آپ نے۔ خاندان میں میری جیسی کوئی لڑکی بھی تو نہیں۔ امی آپ بھی بس — اچھا بیدی گاؤں چلے جائیں تو میں رہنے کے لیے آپ کے پاس آؤں گی۔ وہ اپنی ماں کے پاس اور میں اپنی ماں کے پاس — لندن میں تو ملنے کا لطف ہی نہیں آیا۔ چھپ چھپ کر رازداری سے ملنا تکلیف دہ تھا آئے بھی تو صرف ایک مہینے کے لیے تھے آپ لوگ۔"

"ہاں۔ روزی سے کہیے ذرا صبر کرے۔ سامان تو آ جائے میرا۔ اس کے لیے بہت سی جیولری لائی ہوں۔ بے شمار کپڑے۔ سامان شپ سے آ رہا ہے امی۔ کچھ دیر تو لگے گی۔"

خجستہ بولے جا رہی تھی۔ بیدی کے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ خجستہ تھی؟ فریبی، دھوکے باز — اپنے خسر پر ماں باپ کو لندن بلا لیا۔ اور میں — اپنی ماں سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں اور وہ روڑے اٹکا رہی ہے یہ کیسا انصاف ہے تیری دنیا کا میرے خدا۔

وہ دبے پاؤں باہر نکل گئے اور پرویز کے گھر جا پہنچے اس کی فیملی آ گئی تھی۔ چائے لے کر دونوں ٹیرس پر آ گئے تھے سامنے سڑک تھی۔ رواں دواں ٹریفک۔ بچے، جوان، بوڑھے، عورتیں پیدل، سواریوں پر گزر رہی تھیں۔ موسم خنک ہو چلا تھا۔ ہوا تیز تھی۔ بیدی کے ذہن پر اداسی اور فکر کا بوجھ تھا۔ پرویز کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ "ریلوے بکنگ آفس بند ہو گیا تھا۔"

"تم باقی ایر کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"میں چاہتا تھا اپنے وطن کی سرزمین کو خود بھی پھر سے دیکھوں اور بچوں کو بھی دکھا دوں۔ میں بہت بے تاب ہو گیا ہوں۔"

"تو بچے بھی جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔ انہیں تو میرے ساتھ جانا ہی ہے۔"

"اچھا۔ ہاں یاد آیا۔" پرویز خالی پیالی منڈیر پر رکھ کر بولا۔ "تمہارا وہ شپ آ گیا ہے۔ سامان کے لیے اُدھر بھی جانا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پی آئی اے سے بکنگ کرا لیتا ہوں۔"

"بالکل درست کل سامان کا بھی کر لیں گے۔ اس کے بعد سیٹ بک کرانا۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"نہیں پرویز! تمہاری مہربانی۔ سامان کا تو میں خود ہی کر لوں گا۔ اب تو مجھے یہاں رہنا ہے۔ تو اپنا کام خود کرنے کی

Scan & PDF FIAZ AHMED Friends Korner.com

عادت بھی ڈالنی ہوگی۔ یہاں کے قاعدے قانون، طریقۂ کار یہ سب مجھے معلوم ہونا چاہیے۔" انہوں نے ہنس کر پرویز کو ٹال دیا۔

"ٹھیک ہے۔ کوئی پرابلم ہو تو وہیں سے مجھے فون کر دینا۔"

اگلے دن شام کو۔ خجستہ کے شور شرابے، واویلا کے باوجود وہ اپنے بچوں کو لے کر ایئرپورٹ پر آ گئے۔

"آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟" وہ رونے کو ہو رہی تھی۔

"تم اپنی امی کے گھر چلی جانا۔ میں اپنے بچوں کو اپنا گاؤں، اپنی زمین، اپنی ماں سے ملوانے ضرور لے جاؤں گا۔"

"کتنے دن لگیں گے؟" آواز بھرا گئی تھی۔

"تمہارے پاس خرچ کے لیے کافی رقم ہے۔ فکر ہی کیا ہے۔ خوب شاپنگ کرنا۔"

"میں بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" آخر کو ماں تھی۔

"اور میرے بغیر؟" وہ ہنس دیے تھے اپنے سوال پر۔

وہ اپنی ماں کے بیٹے تھے اور اس سے دس سال سے جدا تھے۔ خجستہ اپنے بیٹوں سے کتنے دن جدا رہ سکتی ہے؟ یہ بھی دیکھنا تھا۔

سب کے جانے کے بعد خجستہ تنہا رہ گئی۔ سناٹا اور ویرانی۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ ان کے ساتھ کیوں نہ چلی گئی۔ اس طرح بچوں کے ساتھ رہتی اور بیدی کو واپس لانے کی کوشش بھی کر سکتی تھی۔ ایک رات تنہا گزارنی مشکل ہو گئی۔ بچے یاد آنے لگے۔ اور بیدی کے بغیر بھی اداس ہو گئی۔ وہ اپنا سامان تیار کرنے لگی۔ امی کے گھر دس بارہ دن تو لگ جائیں گے۔ کیا پتا اور زیادہ۔ بیدی کا کیا بھروسہ۔ انہیں ماں نہ آنے دے یا وہ خود نہ آنا چاہیں۔

لاہور ایئرپورٹ ان کے لیے اجنبی ٹھہرا۔ کوئی شناسا چہرہ ملا نہ آشنا ماحول۔ ٹیکسی انہوں نے سیالکوٹ کے لیے طے کی تھی۔ ڈرائیور باتونی تھا وہ گزرتے ہوئے انہیں لاہور کی سڑکوں کی عمارتوں سے آگاہ کرتا رہا۔

آدھی رات کو سیالکوٹ پہنچے۔ بچے سو گئے تھے۔ ہوٹل میں کمرہ لیا اور صبح سویرے ناشتہ کر کے بس سے روانہ ہو گئے۔ تازہ بارش کی وجہ سے زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اڑ رہی تھی۔ یاسمین کی موتیے کی مہک بارش میں دھل کر دیکھنے والوں کو سرور آمیز نشے سے متعارف کرا رہی تھی۔

یہ آشنا ماحول۔ یہ شناسا خوشبو۔ جانی پہچانی فضا روح میں تازگی سی پیدا کر رہی تھی۔ بچوں کو تمام راستے وہ خاص خاص مقامات کے بارے میں بتاتے رہے۔

بس سے اتر کر تانگہ کرنا پڑا۔ بچے اس سواری پر بیٹھ کر بے حد خوش تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کی مسرت آمیز چیخوں سے آس پاس کا ماحول جگمگا سا گیا۔ ہر سمت خوشی و انبساط کی فراوانی تھی۔ دریائے توی پر پل بن گیا تھا۔ پہلے کی طرح کشتی میں نہیں بیٹھنا پڑا۔

"یہ بجوات کا قصبہ ہے۔ ہم یہاں اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔"

"یہ میدان ہمارا کھیل کا میدان تھا۔ یہ جگہ ہماری میٹنگوں کے لیے مخصوص تھی۔" اور اب گاؤں آ گیا تھا۔ پھولوں سے سجا کلیوں میں گندھا ہوا۔ پھولوں کی بہتات سے اس کا نام پھول کلیاں اور بگڑتے بگڑتے پھولکیاں رہ گیا۔ پتھریلی بڑھی بڑھی گلیاں۔ تانگہ بار بار اچھلتا۔ بچے چیخیں مارتے۔ وہ سناٹے کے عالم میں تانگے کا ڈنڈا پکڑے بیٹھے تھے۔ اتنی جلدی منزل پر پہنچ گئے۔ ان کے اندر طوفان سا اٹھ رہا تھا۔

"اماں۔ اماں۔ میں آ گیا ہوں اماں۔ تم نے بلایا تھا نا؟"

جنشید کی معلومات کے مطابق اماں اب اکیلی رہ گئی تھیں ابا فوت ہو چکے تھے۔ البتہ ایک لڑکی گھر میں رہتی تھی جو اماں کی کفالت بھی کرتی۔ خدمت بھی۔ کون تھی وہ۔؟ ہیجان کے سبب گلے میں پھندے پڑ رہے تھے۔ وہ بچوں کو کچھ نہ بتا سکے۔ کس کی لگی ہے۔ یہ کس دوست کا گھر ہے۔ بعض مکانوں کی شکلیں بھی تبدیل ہو گئی تھیں۔ بعض مکان نیست نابود ہو چکے تھے اور کھنڈروں میں آوارہ کتے چہل قدمی کر رہے تھے اور۔

یہ اپنا گھر آ گیا۔ دل ہی دل میں اماں کی زندگی کی دعا کرتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔ ایک بار۔ دو بار۔ اور دروازہ کھل گیا۔ بڑبڑاتی، کڑکڑاتی دیہاتی ٹائپ لڑکی بارنگ چھینٹ کے کپڑوں میں ملبوس دروازہ روکے کھڑی تھی چہرے پر ناگواری آنکھوں میں غصہ لیے۔ وہ گہری نظروں سے اس کی آنکھوں میں راز کی بات کھوجنے لگے۔ (کون ہے یہ)

سیاہ چمکدار آنکھیں، بولتی ہوئی۔ ذہین اور خوبصورت۔ سانولی رنگت۔ کالے بالوں والے سر پر چادر کا پلو لیے۔ ہونٹ سکوڑے انہیں گھور رہی تھی۔

"کون ہو تم۔؟ اتنی زور سے دروازہ بجاتے ہیں بھلا؟ حشر کے مردے بھی جاگ جائیں۔"

اکھڑ بلکہ بدتمیز سا لہجہ۔ اُجڈ رویہ۔

"میں۔ میں ہوں۔" وہ سٹپٹا گئے۔ اپنے ہی گھر کے دروازے پر اپنا نام بتا کر گھر میں داخلے کی اجازت لینا بہت تکلیف دہ امر تھا۔

"میں کون؟" وہ انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھ رہی تھی۔ "بلے بھئی کیا ٹور ہیں۔" بڑبڑائی۔

"راستہ دو۔" وہ اکڑ کر بولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے دھکیلنا چاہا۔

"اے۔ اے۔ اے۔" دروازہ روک کر تن کر کھڑی ہو گئی۔ "اگر اسی طرح لوگ گھر میں گھسنے لگے تو میرا بھلا یہاں کیا فائدہ۔" پیچھے سے اس نے ڈنڈا بھی اٹھا لیا اور انہیں ایک بھبکی سی دی۔ جیسے مارنے کو آگے بڑھی ہو۔

وہ بے چارگی سے پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے۔ تانگے والا سوٹ کیس اتار کر نیچے رکھ رہا تھا۔ جہازی سائز سوٹ کیس۔ اور بچے اپنے اپنے بیگ لیے اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"میں بیدار ہوں۔ بیدی۔"

ہونٹ چبا کر بولنا پڑا تھا۔ لڑکی نے ان کے عقب میں جھانکا اور بچوں کو دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اور جب وہ سوٹ کیس گھسیٹتے اندر داخل ہوئے تو وہ سامنے کے کمرے میں روپوش ہو چکی تھی۔

"اماں۔ اماں۔" پکارتے رہے کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ کسی نے جی آیاں نہیں کہا۔ کوئی ممتا کی ماری میرا بیٹا آ گیا کہتی ہوئی دیوانہ وار باہر نہ نکلی۔

"اماں؛ اماں!" وہ چیختے ہوئے سامنے کے کمرے میں جا گھسے جہاں وہ لڑکی گئی تھی۔ گھر وہی تھا۔ وہ اس گھر کے چپے چپے کو پہچانتے تھے۔ بوسیدہ دیواریں۔ ٹوٹا پھوٹا فرش، کونے میں پرانے کپڑوں کا ڈھیر اور اس۔ گودڑ خانے پر وہ لڑکی منہ موڑے بیٹھی تھی۔ شاید رو رہی تھی

"اماں کہاں ہیں میری۔؟" وہ چلائے۔ ان کی آواز پھٹ گئی۔ آگے بڑھ کر اس کے سر کو پکڑ کر زور سے ہلایا۔

"میری اماں؟"

وہ کھڑی ہو گئی۔ "چلو۔ دوسرے کمرے میں۔ تین دن سے بات کر رہی ہیں نہ آنکھیں کھول رہی ہیں۔"

وہ آگے۔ یہ پیچھے صحن میں آ گئے۔ بچے بیگ لٹکائے حیران کھڑے تھے۔ پھر انہیں کونے میں ایک بگلی نظر آئی۔ دونوں خوشی کی چیخ مارتے ہوئے بگلی کی طرف لپک گئے۔ باپ سے بے نیاز جو اس کالی لڑکی کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا گھسے تھے۔ لڑکی دہلیز پر رک گئی۔ منہ اٹھا کر اس نے تندہی سے پوچھا۔

"تم نے اتنی دیر کیوں کی؟" وہ ہکا بکا اسے تکتے رہے۔

"ہم تو دو برس سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ دو برس سے۔ ہر روز۔" وہ پھر مڑی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

کمرہ۔ ابا کی بیٹھک۔ بے رنگ دیواریں۔ ٹوٹا اکھڑا فرش۔ جھلنگے پلنگ پر ان کی موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ماں۔ کائنات جیسے ٹھہر گئی۔ ہر سو سناٹا طاری ہو گیا۔ اسی کی خاطر۔ اسی وجود کے لیے انہوں نے یہ طویل سفر کیا تھا۔

"ماں؛" وہ اس کے سرہانے کھڑے تھے۔ جھک کر ماں کے بے ترتیب سانسوں کا شمار کرنے لگے

"اماں؛" انہوں نے ماں کے سر کو سہلاتے ہوئے پیار سے پکارا۔ وہ جو اس گھر سے زیادہ بوسیدہ بوڑھا وجود تھا۔ ٹوٹا پھوٹا کھنڈر۔

"اماں۔ اماں۔ میں آ گیا اماں۔ تم نے بلایا تھا مجھے۔"

"تین دن پہلے تک ہر روز یہی کہتی تھیں۔ میرا بیدی سی آ گیا ہے۔ آنے والا ہے۔ روز کھانا پکا تی تھیں۔ مگر اب تو دو دن سے نہ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔ نہ بولتی ہیں۔"

"اماں۔ اماں۔ اماں۔ میری پیاری اماں؛" انہوں نے جھک کر ماں کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے

پہلے بھی وہ اسکول کالج سے آتے اماں سوئی ہوتیں تو وہ ان کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیتے سر کو ان کی پیشانی پر رگڑتے اماں جاگ اٹھتی تھیں۔ "آ گیا میرا بیدی" کہہ کر اٹھ جاتی تھیں۔

"آ گیا۔" اماں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ لڑکی حیرت سے دم بخود کھڑی رہ گئی۔

اب تو یوں لگ رہا تھا کہ یہی حاصلِ کائنات ہے۔۔۔ ماں۔ ماں کا وجود۔

"اماں۔ اماں۔ میری اماں۔" والہانہ محبت اور اس کے اظہار کے لیے ان کے پاس کوئی اور ذریعہ بھی نہ تھا سوائے اس کے کہ اماں کو چٹا چٹ چومتے رہیں۔ قدرت نے نیم جان اعضا میں جان ڈال دی۔ اندھیرے میں سورج کی کرنوں نے اُجالا پھیلا دیا تھا۔ نحیف وجود۔ نقیہہ آواز۔

Scan & PDF FAIZ AHMED Friends Konnect.com

"ارے میرا بیدی آگیا۔"

یہ اسکول کالج والا وہ چھوکرا نہ تھا۔ بلکہ بھرے بھرے جسم کا توانا مرد۔ ان کے سوکھے چھوہارا سے برادن ہاتھ بلائیں لینے کو آگے بڑھے۔ وہ ان بوڑھے ہاتھوں پر نثار ہونے کو بے تاب ہو گئے۔ حیرتوں بھرے چہرے پر آنسوؤں کی قطاریں چمک رہی تھیں۔ کب کب کے رُکے ہوئے آنسو تواتر سے آبشار بن کر گردن پر لڑھک رہے تھے۔ یہ چہرہ۔ یہ چہرہ تو فرزند علی کی ماں سے مشابہ تھا۔ (شاید ہر دکھی ماں بیٹے کی جدائی میں اس صورت کی ہو جاتی ہوگی۔) سال بھر سے بیتے سنبھالے مایوسی کے اندھیروں سے جنگ کرتا منحنی وجود۔ بیٹے کی آواز، اس کے سانسوں کی حرارت سے یوں اٹھ کر بیٹھ گئی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ ماں۔

"یہ۔ یہ کون ہے اماں؟" شام تک اماں تندرست ہو چکی تھیں۔

"ارے۔ یہ موتی ہے۔ بھول گیا۔ اتنی جلدی۔۔؟"

اتنی جلدی؟ کیا انہوں نے واپسی میں دیر نہیں کر دی تھی اماں کے پاس دنوں، سالوں کو ناپنے کا پیمانہ ہر ماں سے الگ ہے؟ یا بیٹے کے لیے دیر۔ دوسروں کے لیے جلدی۔ اس موتی سے بچ کر تو وہ کراچی اور وہاں سے لندن بھاگے تھے۔

"یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟"

"میری خدمت اور گھر کی دیکھ بھال۔" اماں تاشپاتی کا بوس پی رہی تھیں۔

"گھر کی دیکھ بھال؟" وہ طنز سے در و دیوار پر نظریں ڈال کر اسے گھورنے لگے۔

"اے۔ اے۔ خبردار۔ مجھے الزام نہ دینا۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھے لڑنے کو آگئی تھی۔

"ہوتے میرے پاس بھی چار پیسے تو گھر کی مرمت کراتی سمجھے۔ بہت دولت کما کر لائے ہو گے۔ لگا دینا۔ ہم تمہارے شرمندۂ احسان نہیں۔" وہ لڑا کا بھی تھی۔ منہ زور بھی۔

پوتوں کو سینے سے لگا کر دادی کی رہی سہی کمزوری بھی جاتی رہی۔ "ماں کہاں ہے ان کی؟"

"وہیں کراچی میں۔" جانے کیوں نظریں جھک گئی تھیں قالینوں، غالیچوں پر پلے ہوئے بچے کچی زمین پر دھول اڑاتے دوڑیں لگا رہے تھے۔ ان کی شوخیوں بھری آوازیں گھر کے کونے کونے میں گونج رہی تھیں۔ دادی طمانیت سے انہیں دیکھتا دیکھ رہی تھیں۔

"پڑی رہے کراچی میں۔ نہیں آتی تو نہ آئے۔" انہوں نے پڑوسن کو بہو کے بارے میں سوال پر جواب دیا۔

"میرے بیٹے کو لڑکیوں کی کوئی کمی ہے؟" کنکھیوں سے انہوں نے موتی کو دیکھا جو نہایت انہماک سے دال میں ڈوئی گھما رہی تھی۔

بیدار بخت آگیا۔ یہ خبر بجلی کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ دن بھر ملنے آتے رہے۔ بیدی نے ان سب کی زبان سے ایک ہی قسم کی بات سُنی۔

"موتی کی کیا بات ہے۔ دس برس سے خالہ کی کفالت کر رہی ہے۔ بڑی سمجھ دار۔ ہمت والی ہے۔ خوش بختی ہے ہماری کہ یہ یہاں آکر رہی۔"

"جب سے آئی ہے کھیتوں میں بھرپور فصل ہو رہی ہے رحمت والی بارش سے بڑھ کر ہے اس کا وجود۔" یہ ایک کاشتکار کا تجزیہ تھا۔

انہیں مگر چند دن میں ہی اس کی بدتمیزیوں اور اُجڈ پن سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ عجیب سر پھری اور بدمزاج تھی۔ کھانا چولہے پر چھوڑ کر آجاتی۔ اکھڑپن سے کہتی

"بھاؤ۔ جو ملے سے کھانا کھا لو۔ اپنے ہاتھ سے کچھ کرو گے تو نعل نہیں جھڑ جائیں گے۔"

وہ جز بز ہوتے۔ "بچے۔۔؟"

"بچے کھا چکے ہیں۔ میں اور خالہ بھی۔ ہم تو دیہاتی لوگ ہیں کھانا جلدی کھاتے ہیں۔"

"میں بھی دیہاتی ہوں۔" وہ اس کے طنز سے جل جاتے۔

"کب سے انتظار کر رہا ہوں کہ تم بلاؤ تو کھانا کھاؤں۔ بھوک لگی ہے۔"

"ہم انگریز نہیں کہ گھنٹہ بجائیں۔ دعوت نامہ بھیجیں۔ لباس تبدیل کریں۔ جب کھانے کا وقت ہوتا ہے تو سب جمع ہو جاتے ہیں۔ کھا لیتے ہیں۔"

وہ دل جلی تھی۔ اور منہ پھٹ۔ مٹی کی کالی ہانڈی۔ لکڑی کا کنارے ٹوٹا چمچہ (ڈوئی) تام چینی کی پلیٹیں۔ یہ ان کا ماضی تھا۔ مگر اب انہیں برتنوں سے کراہت آتی تھی۔ مٹی سے اٹے کمرے میں گودڑ جیسے بستر پر لیٹنا دوبھر ہو جاتا۔ مگر وہ بڑے ٹھسّے سے کہتی۔

"صاف چادر بچھا تو دی ہے۔ اتنے نخرے کیوں کرنے لگے ہو؟"

"صاف۔۔؟ اسے صاف کہتے ہیں؟ تو پھر گندا کسے کہتے ہیں؟" وہ چیخ اُٹھتے۔

وہ آنکھیں مٹکاتی۔ انہیں گھورتی۔ پھر۔

"بابا! تم تو بہت ہی زیادہ نخریلے ہو۔ لندن میں کیا وزیر اعظم کا عہدہ تمہارے پاس تھا؟ اب بھلا میں قیمتی چادریں کہاں سے لاؤں۔؟"

وہ منگتی ہوئی دوسری طرف چلی جاتی۔ بے نیاز۔ لاپروا۔

اماں اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی رہتیں۔

"کیسی خدمت کی اس نے میری۔ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ ہاتھ بھر سے، پیسے سے، محنت سے۔ اس نے دس برس میرا سایہ بن کر گزارے۔ بیدی۔ میری بچی کو دکھ نہ دینا! اس کی ذمہ داری اب تیرے سر ہے بیٹا۔ یہ تو اپنی زبان سے تسلیاں دلاسے دے کر امیدوں کی روشنی دکھا کر مجھے زندگی کی طرف کھینچتی رہی۔ ایسی لڑکیاں کبھی کبھار پیدا ہوتی ہیں بیٹے۔"

وہ متاثر ہو جاتے۔ واقعی اماں کی دیکھ بھال کر کے اس نے ان کے اوپر احسان کا پہاڑ رکھ دیا تھا۔ پھر جب کھانے کو کچھ نہ رہا اس نے بچوں کے اسکول میں ملازمت کر لی۔

وہ پرائمری پاس تھی۔ اسے کا امتحان دے کر کامیاب ہوئی تھی۔

"تم لندن واپس کب جاؤ گے؟"

نہ کوئی ادب۔ نہ لحاظ۔ نہ تہذیب۔ گنوار۔ اُجڈ سوال یوں کرتی جیسے لٹھ مار رہی ہو۔ وہ اس پر بھنا جاتے۔

"کیوں۔ گھبرا گئیں؟" طنز کرنے سے وہ بھی باز نہ آتے

"میں۔ نہیں۔ آخر یہ بچے کب تک ماں کے بغیر رہیں گے۔"

"یہ تو خوش ہیں۔"

"رات کو خوش نہیں ہوتے۔ رو رو کر سوتے ہیں۔"

"میں سمجھا دوں گا۔"

"کب تک سمجھاؤ گے۔ بلا لو نا اپنی بیگم کو۔"

"اسے یہاں کی گلیاں، یہ مکان، یہ گرد و غبار پسند نہیں۔"

"اور تم۔۔؟ تم بھی پسند نہیں؟ اگر تم پسند ہو تو یہ سب بھی اپنانا ہو گا۔ آخر تم بھی اسی گرد و غبار کی پیداوار ہو۔ اسی گھر میں پلے ہو۔ کیا تم سے اتنی بھی دلچسپی ہے کہ تم لندن میں رہو تو وہ بھی رہے۔" نکتہ پیدا کرنا بائیں ہاتھ کا کام تھا اس کے۔

"میں جبر کا قائل نہیں۔ اسے چمکتی دمکتی دنیا پسند ہے۔" وہ پسپا ہو جاتے۔

"کیا اس نے چمکتی دمکتی دنیا سے شادی کی تھی؟ اس وقت تم کیا تھے؟"

وہ چپ ہو گئے۔ شاید خجستہ نے ان کے شاندار مستقبل کو بھانپ لیا تھا۔ یا پھر وہ واقعی خوش قسمت تھی۔ سیالکوٹ کے سادہ اور دیہاتی قصبے بجوات کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا پڑھا لکھا نوجوان۔ اپنی تھوڑی سی زمین کے دام کھرے کر کے لندن کے لیے روانہ ہوا تھا۔

اس نے بیروزگاری کے خلاف جدوجہد کا آغاز کراچی جا کر کیا تھا۔ اور کون جانتا تھا کہ کراچی میں اسے لندن کا چانس مل جائے گا تو وہ اپنے گاؤں، اپنے والدین، ہری بھری زمین۔ آزادیوں کے گیت بھول جائے گا۔

"عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہیے۔ چاہے وہ جنگل ہو۔ دیہات یا اندھیری سرنگ۔ جب تک دونوں ساتھ نہ ہوں عمر ضائع ہوتی ہے۔ تم اب لندن جانے کا خیال تھوک دو۔ اپنے گاؤں میں ہی رہو۔" اسے نصیحت کرنے کا بھی شوق تھا۔ عقلمندی کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔

"اچھا۔ اور کریں کیا۔۔؟" وہ چڑ گئے۔

"ہل چلانا بھول گئے ہو تو ٹریکٹر خرید لو۔ اتنی دولت کمائی ہے اسے کام میں لاؤ۔"

"اور زمین کیا آسمان پر ہے؟"

"کیا اپنی جدی پشتی زمین کو بھول گئے۔ دو وقت کی روٹی تو وہ دے ہی دیتی تھی۔ تمہارے لیے تو وہی زمین، وہی آسمان تھا۔" وہ اپنی جگہ سے ہٹی۔ پھر کچھ کاغذات ان کی گود میں ڈال گئی۔ "لو۔ یہ رہے تمہاری زمین کی ملکیت کے کاغذ۔ سنبھال لو۔"

بڑی پھرتی سے انہوں نے کاغذات کھول ڈالے۔

"پائی پائی جوڑ کر۔ قرض لے کر تمہاری زمین واپس لی۔ ادا کر رہی ہوں ابھی تک وہ قرض۔ صرف اس امید میں کہ کبھی واپس لوٹو تو یہاں رہنے سے انکار کا یہ جواز نہ ہو کہ زمین نہیں ہے۔ خاطر جمع رکھو۔ تم پہلے بے زمین تھے نہ آج ہو۔ تم کیسے بیٹے ہو۔ اپنی ماں کو بھی بھول گئے۔"

وہ بار بار انہیں بھول جانے کے طعنے دیتی۔

Scan & PDF IFTIKHAR AHMED Friends Korner.com

"ارے تم ہی تو جاتے وقت مجھ سے کہہ گئے تھے ابا اماں کو تمہارے بھروسے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یہ بھی بھول گئے؟"

وہ سر پیٹتی۔ وہ بھی سر پیٹ کر رہ گئے۔

کراچی جاتے وقت اماں دہائی دے رہی تھیں۔ تب ایک سوکھی چرخ سی لڑکی آنسو بہاتی ان کے دامن کو تھام کر کھڑی ہو گئی تب انہوں نے کہا تھا۔

"اماں ابا کو تمہارے بھروسے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

تب سے اس نے اس گھر کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ کبھی کبھی اس کی خوبیاں ان پر حاوی ہونے لگتیں۔ اس میں بانکپن تھا، وقار تھا اور خودداری۔ ہاں وہ بولتی تو تمام خصوصیات کہیں گم ہو جاتیں۔

اس بار وہ سیالکوٹ گئے تو واپسی میں پورا ٹرک بھر کر لئے اماں اور موتی ہی کیا سارا گاؤں اس بوسیدہ مکان کے دروازے پر بڑے بڑے کریٹ اترتے دیکھ رہا تھا۔ ان کا وہ سامان جو کراچی سے سیالکوٹ کے لیے بک کرایا تھا۔ مال گاڑی کے ذریعے آگیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اکثر بدتمیز سا لہجہ۔ وہ ایک کریٹ کو ٹھوکر مار کر ان سے پوچھ رہی تھی۔ "یہ کیا ہے؟"

"میری گاڑھے پسینے کی کمائی۔" انہوں نے فخر سے کہا۔

خجستہ کی ذہنی کیفیت کا وہ اندازہ ہی کر سکتے تھے یقین سے نہ کہہ سکتے تھے کہ اس نے اس خبر کو کس دل سے سنا ہو گا۔

محض اتفاقاً اس نے پرویز کو فون کر لیا تھا۔ بیدی کے پروگرام کا معلوم کرنے۔ تب پرویز کی زبانی اسے علم ہوا کہ شب تو بیدی کے سامنے ہی آگیا تھا اور اس نے سارا سامان سیالکوٹ کے لیے بک کرا دیا تھا۔ خجستہ کی چیخ نکل گئی۔ "ہائے میرا قیمتی سامان ڈنر سیٹ۔ پردے اور بستر۔ سینریاں۔ کیا اس سڑے ہوئے گاؤں میں سنہرے فریم والی سینریاں لگائی جائیں گی۔ کتنا گھاٹے کا سودا ہے بیدی۔ سارا سامان اس لیے لے گیا ہے کہ میں اس کے پیچھے چلی جاؤں۔" غصے میں باؤلی ہو کر۔ وہ گھر کے برتن توڑنے لگی چھناک چھناک۔

"بیٹے بیدی۔ ایک بات کہتی ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ایک تمنا رہ گئی ہے۔" اماں بیٹے کو پاس بٹھائے خاص بات کہنے کے موڈ میں تھیں۔

"موتی کو ایک گھر کا آسرا مل جاتا تو میں آسانی سے مرجاتی دل میں تو یہی سوچے بیٹھی تھی کہ جب بھی تو آئے گا تیرا نکاح اس کے ساتھ ضرور پڑھواؤں گی۔ بیٹے۔ مرد کو تو چار جائز ہیں۔"

وہ تعجب سے اماں کو دیکھتے رہے۔

"جس گھر میں جائے گی چاندنی ہو جائے گی۔ میری آرزو ہے۔ (اس کالی، بدداغ۔ بدمزاج لڑکی سے اندھیرا ہو سکتا تھا) ایک آرزو تجھے دیکھنے کی تھی دوسری تجھ سے موتی کا بیاہ۔"

"اماں! اس کے سوا کچھ بھی کہو گی مانوں گا۔"

خجستہ پر غصہ اب کم ہو گیا تھا۔ تمام سامان گاؤں لا کر اقدام تولے ہی بچے تھے۔ خجستہ کیا کیا نہ تڑپی ہو گی۔

پرویز نے تعجب سے پوچھا تھا۔ آپ کو اس گاؤں کا نام بھی نہیں معلوم؟ یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ نے کبھی پوچھا بھی نہیں حد ہے۔"

خجستہ کیا بتاتی۔ وہ تو بیدی کے دل و دماغ سے اس گاؤں کا نام اور یاد فراموش کرنا چاہتی تھی

ارے گھر کے لیے کیا کیا لائی تھی اور اسی کے لیے کتنی بے شمار چیزیں (مادر جیولری)

"یہ سامان یونہی بند رہے گا۔" انہیں ہاتھ میں ہتھوڑا پکڑے کریٹ کھولنے کی تیاری کرتے دیکھ کر موتی نے کہا۔ اس سامان کو تمہاری بیوی کھولے گی۔"

اس نے ان کے ہاتھ سے ہتھوڑی چھین لی۔ وہ سراسیمہ ہو گئے۔ غصہ آگیا۔

"اچھا۔ یہ بات ہے تو میں آج ہی نکاح کر کے دکھا دوں گا۔"

آناً فاناً اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"میں نے تو۔" وہ لڑکھڑا گئی۔ "ان بچوں کی ماں کے لیے کہا تھا۔ وہ کیا سوچے گی۔"

آواز میں دھیما پن، لہجے میں پسپائی۔ آہا یہ تو لطف کی بات تھی۔ کوئی حملہ، کوئی دھمکی ایسی بھی تھی جس سے اس سر پھری گستاخ لڑکی کا لہجہ بدل سکتا ہے۔ اسے پسپا ہوتا دیکھ کر انہیں بڑی خوشی ہوئی۔

"یہ پرانا دھرانا گھر بھلا اس قابل ہے کہ اس میں یہ قیمتی چیزیں رکھی جائیں۔ گرد میں اٹ کر غارت ہو جائیں گی۔"

اس نے فوراً پینترا بدلا۔ فیصلہ صادر کیا اور چل دی۔

اگلے دن وہ اسکول سے لوٹی تو صحن میں مزدور جمع تھے بنیادیں کھودی جا رہی تھیں۔ شام تک گلی میں اینٹوں کے انبار، ریت اور روڑی کے پہاڑ کھڑے ہو گئے۔ اماں بہت خوش تھیں۔ "دیکھ دیکھ موتی۔ تیرا گھر بن رہا ہے۔"

"صحن تنگ ہو جائے گا۔ شہر کے گھروں جیسا۔" وہ نہایت تنک مزاجی سے منہ بگاڑ کر بولی۔

انہوں نے اماں کے مشورے سے خجستہ کو خط لکھ دیا۔ اپنی بچوں کی خیریت، صحت و خوشی کا حال اور یہیں رہ جانے کا عزم۔ تم چاہو تو آسکتی ہو۔ میں نیا گھر بنا رہا ہوں۔"

پہلا خط رکھا پھینکا محض ضابطے کی کارروائی تھی۔

خجستہ کا جواب بھی آگیا۔ برہمی، دھمکی اور تمسخر سے بھرا ہوا۔ سنتی ہے گاؤں نہ آنے کا عزم۔

"تم سود و فعہ میرے پاس آؤ گے۔ جہاں بھی میں ہوں گی اول یہ کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ میری حفاظت اور تعاون تمہارا فرض ہے۔ دوئم میں تمہارے بچوں کی ماں ہوں۔ سوئم یہ کہ میری جیسی خدمت گزار، اطاعت شعار، نیک بیوی تمہیں کہیں نہیں ملے گی۔ چہارم یہ کہ تمہیں بھی گاؤں کی زندگی راس نہیں آئے گی۔ وہاں ہے کیا؟ زمین وہاں تمہاری نہیں ہے۔ کوئی سوسائٹی نہیں۔ اچھے اسکول نہیں۔ وہاں ماں کے سوا اور کیا ہے۔ اور ماں کو کراچی لانا اتنا مشکل نہیں۔" تحریر غرور سے بھری ہوئی تھی۔

"خجستہ بیگم۔ میں اب یہیں رہنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ مکان بن رہا ہے۔ جہاں میں نے پڑھا ہے۔ وہیں میرے بچے پڑھ لیں گے۔ جو میں بچپن سے سہتا آیا ہوں وہ بچے بھی سہہ لیں گے۔ ہم۔ میں اور میرے بچے مل جل کر اپنی جنت تعمیر کر لیں گے۔ تم ہمارے بغیر رہ سکتی ہو۔ تو رہو۔ خرچ بھیجتا رہوں گا۔"

خط پڑھ کر خجستہ روئی۔ سالہا سال کی خدمت گزاریوں کا یہ صلہ؟ اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ اس نے غصے میں بھرا خط لکھا۔ جواب فوراً ہی آیا۔

"ہاں۔ اگر تم ضد کر سکتی ہو تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ تمہاری خدمت کا صلہ تمہیں مل چکا ہے۔ تم نے میری کمائی اپنی مرضی سے خرچ کی اور اگر میں کہوں کہ بے دھڑک لٹائی تو یہ غلط نہ ہو گا۔ اب میں پچھتاتا ہوں کہ تم پر اتنا بھروسہ کر کے مجھے کیا ملا؟ میں نے دس گیارہ سال کا بن باس کاٹا۔ اس کا مجھے کیا صلہ ملا؟ ماں سے دوری۔ اپنوں سے جدائی۔ کاش میں اپنے ہاتھوں سے خرچ کرتا۔ اور اتنا تو بچا لیتا کہ کسی کے کام آسکتا۔ یہاں لوگ ایک ایک پیسے کو ترستے

آپ کے لیے بہترین
ناولوں کا انتخاب

اک لڑکی پاگل پاگل سی، رضیہ جمیل =/60
درد کے فاصلے، رضیہ جمیل =/120
میرے ندیم، رضیہ جمیل =/60
سوچ نگر کی رانی، رضیہ جمیل =/60
آنگن کا چاند، رضیہ جمیل =/60
دل ایک گلشن، رضیہ جمیل =/60
شعاع، نادرہ خاتون =/75
حنا، نادرہ خاتون =/75
چلمن، نادرہ خاتون =/75
کنول، نادرہ خاتون =/45
عرفانہ، نادرہ خاتون =/36
دردانہ، نادرہ خاتون =/36
لبنیٰ، نادرہ خاتون =/45
شگوفہ، نادرہ خاتون =/36
بے نام سی خلش، رضیہ جمیل =/60

اس پتے پر خط لکھیں،

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
۳۷، اردو بازار، کراچی

ہیں۔ ضروریات زندگی کا حصول ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ پیسہ ہر کسی کی ضرورت ہے۔ جو ان کے پاس نہیں ہے۔ کاش کہ میں اپنے مقصد کو مدنظر رکھ کر کچھ بچاتا۔ تو آج کروڑ پتی ہوتا۔ اور اس پوزیشن میں ہوتا کہ غریب، محتاج لوگوں کی وقتاً فوقتاً مدد کر سکوں مگر تم نے مجھے دیوالیہ کرنے میں کوئی تکلیف نہیں کیا۔ میں کمانی کرنے والی مشین بن گیا۔ مگر کمائی کہاں ہے؟ اب بے جا اسراف کی تمہیں سزا ملنی چاہیے۔"

تین مہینے میں دو بیڈروم، باتھ روم ایک اسٹڈی روم بن کر تیار ہو گئے۔ تین مہینے خط کتابت بھی جاری رہی۔ جس میں خجستہ کی جانب سے مامتا کی تڑپ بھی نظر آئی۔

موقی کا وہی اکھڑ رویہ وہی روکھا انداز۔ اس کی فطرت ہی سخت مٹی سے بنائی گئی تھی۔ یا شاید حالات کی گرم دھوپ میں تپ کر وہ پتھر بن گئی تھی۔ وہ بچوں کے لیے نرم ہو جاتی مگر بیدی کی پرواکر نا یا انہیں اہمیت دینا ضروری نہ سمجھتی۔

"خود ہی کھالو۔ خود ہی یہ کر لو۔ وہ کر لو۔"

"مجھے کیا پتا تمہاری کونسی چیز کہاں ہے۔ اپنی چیز کا خود خیال رکھا کرو۔"

"بھئی، سر میں درد ہے تو گولی کھاؤ اور لیٹ جاؤ۔ اِدھر اُدھر گھستے کیوں پھر رہے ہو۔ تنہائی کی عادت ڈالو۔ اپنے آپ کو لینڈ لارڈ سمجھنا چھوڑ دو۔"

کبھی ان کے خفا ہونے پر چیخ پڑتی۔

"میں تمہارے رعب میں نہیں آؤں گی۔ ہو گے تم کہیں کے بڑے آدمی۔ میرے لیے تو وہی بیدی ہو جو ماں باپ کو مصیبتوں میں مبتلا کر کے فرار ہو گیا تھا۔ تمہیں اس جرم کی سزا ملنی چاہیے۔"

کبھی وہ بیزار ہو جاتے۔ تلاش کرتے کرتے تھک جاتے اور مطلوبہ کپڑے یا جوتے نظر نہ آتے۔ اس سے دبی زبان سے درخواست کرتے تو وہ ہنگامہ اٹھا لیتی۔

"اپنے کپڑے خود ہی دھونے، سمیٹنے، رکھنے کی عادت ڈالو۔ مجھ پر فرض نہیں ہے کہ میں اسکول سے آ کر تمہاری چیزوں کی خبر گیری کروں۔ اپنے بچوں کو خود سنبھالا کرو۔ انہیں بھی اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالو۔"

ہر روز اسی طرح کے جلے طنز میں لپٹے فقرے سننے کو ملتے۔ وہ سننے اور اپنا کام خود کرنے کے عادی ہوتے گئے۔ خجستہ نے انہیں نکما بنا دیا تھا۔ اب وہ بہت کام کے ہو گئے۔

بچے بھی اپنا کام خود کر لیتے۔ وہ موقی کی زیر ہدایت پھرتی سے کپڑے پہنتے۔ جوتے چڑھاتے بیگ اٹھا کر اسکول جانے کے لیے تیار ہو جاتے۔ انہیں موقی آنٹی بہت پسند تھیں۔ سخت گیر اور باعزت۔ وہ کسی سے بھی نہیں ڈرتی تھیں۔ برسوں سے دادی کے ہمراہ اکیلی رہتی تھیں۔ انہوں نے کئی بار چور کو مار بھگایا۔ ایک دفعہ بھیڑیے سے جنگ کی۔ انہیں یقین تھا کہ وہ شیر سے بھی نہیں ڈریں گی۔ دونوں بچے موقی کی حمایت اور تعریف میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔

گاؤں والوں نے بھی موقی کی شخصیت کو بے داغ بنایا ہوا تھا۔ اس کی سختی جس میں یا نکپن تھا۔ اس کی تلخ نوائی نہیں میں سچائی ہوتی۔ اس نے ان کے گھر کو برسوں اپنے لہو اور پسینے کا خراج دیا تھا۔ وہ کتنی بہادر اور ذمہ دار تھی۔ محض ان کے ایک جملے پر اپنی زندگی اماں کے لیے وقف کر دی۔ وہ جو کسی سے متاثر نہیں ہوتے مگر دلیر ہوتے ہیں، جو فرمانبردار نہ سہی مگر سچے ہوتے ہیں۔ جو بے دھڑک بولتے ہیں ان کے دل میں کھوٹ نہیں ہوتا۔ وہ منافق نہیں ہوتے۔ ان کے ساتھ زندگی کا سفر۔ انعام ہوتا ہے۔

انہیں یقین آتا جا رہا تھا کہ وہ گھر جہاں وہ جائے گی۔ خوش نصیب ہو گا۔ وہ اپنی سچائی سے ہر جگہ روشنی پھیلا سکتی ہے۔ بہادر، پُرعزم، بے لچک اور بے غرض۔

وہ سخت سردی میں سکڑ رہی تھی۔ انہوں نے اپنے کمرے سے ایک شال لا کر اس کے کندھوں پر ڈال دی۔ وہ اُچھل پڑی۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"مت مہربانی کیا کرو میرے ساتھ۔" وہ چیخ پڑی۔

"چاپلوسی پسند نہیں ہے مجھے۔" اس نے شال اٹھا کر دور پھینک دی۔

انہیں بڑا غصہ آیا۔ "چاپلوسی کی کیا بات ہے۔ کیا میں کوئی تحفہ بھی نہیں دے سکتا۔"

"اپنی بیوی کی چیزیں بانٹتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ وہ آ کر پوچھے تو کیا کہو گے۔"

"وہ سوال کرے گی تو جواب تم نہیں دو گی۔ میں ہی دے لوں گا۔"

وہ جھلا گئے۔ عجیب خردماغ لڑکی ہے۔ اس کی تلخ بیانی کے باوجود وہ اس کے مزاجی انوکھے پن سے مرعوب ہو جاتے۔ وہ کسی سے ڈرتی نہ تھی جو بہتر سمجھتی بے دھڑک کر گزرتی۔ گاؤں میں اس کی عزت اور شہرت تھی۔

"تم نے بھی شہر میں جا کر سر چھوڑا بیدی یار۔" ان کے لنگوٹیا یار نے افسوس کے لہجے میں کہا تھا۔ "اپنے گھر میں جنت کی حور موجود تھی۔ اسے نہ جانا، نہ پہچانا۔ چلے گئے۔ ارے اس کی قدر تو ہم سے پوچھو۔ پڑھ لکھ کر کیسے اعلا عہدے پر پہنچی۔ سارے گاؤں میں سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ ہاں۔"

وہ بھونچکا رہ گئے۔ جنت کی حور؟ اور موقی۔ وہ سانولی بلکہ کالی۔ بدرنگ کپڑوں میں اور بھی کم رو نظر آتی مگر لوگوں کے لیے یہ بھی اس کی ایک خوبی تھی۔ انہوں نے خجستہ کو ایک خط لکھ ڈالا۔

"بہت اچھا خوبصورت گھر بنایا ہے۔ تمہارے لیے۔ میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ اماں تمہیں دیکھنے کو تڑپ رہی ہیں۔ تمہارا سب سامان ابھی تک کرٹنوں میں بند رکھا ہے۔ بچے بھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔"

اس کا جواب آ گیا۔ "بچوں کا نام لے کر مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے تم۔ میں ایک شہری لڑکی ہوں۔ تمہارا گاؤں تمہیں مبارک ہو۔ میں کراچی سے لندن جانے کا سوچ رہی ہوں۔ گاؤں آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں جس زندگی جس ماحول کی عادی ہو چکی ہوں۔ اسی میں زندہ رہ سکتی ہوں۔ گاؤں میں تو مر کر بھی نہیں آ سکتی۔ اب میرا خرچ تم لندن بھیجا کرنا۔ میں پہنچ کر اپنا ایڈریس لکھ دوں گی۔"

وہ بھنا گئے۔ خجستہ اتنی بے حس، اتنی سنگدل۔ تم بچوں کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ انہوں نے سیالکوٹ جا کر اسے فون کیا۔ آواز سے ان کی تڑپ اور کوفت محسوس کر کے اور بھی اکڑ گئی۔

"کہہ جو دیا کہ نہیں، نہیں، نہیں۔ بس یہ میرا فیصلہ ہے۔" وہ زور سے بولی۔

"خجستہ! دیکھو۔ غور کرو۔ میں بہت عرصہ بعد اپنے مقام پر پہنچا ہوں۔ اپنی ماں کے پاس۔ جو میری زمین میرا آسمان ہیں۔ مجھے ان کے پاس رہنا ہے۔ تم بھی اپنے بچوں کے پاس رہ سکتی ہو۔"

وہ التجائیہ انداز میں اس کی منت کرنے لگے۔

"تم نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔" وہ پھر چلائی۔

"تمہیں احساس ہی نہیں۔ تم کیا کرو گے۔ کاشتکاری؟ مجھے پسند نہیں۔ مجھے کسی کسان کی بیوی بننا منظور نہیں سنا۔ میں تمہارے بغیر اور بچوں کے بغیر بھی زندہ ہوں۔ خوش ہوں۔"

"نہیں۔ تم خوش نہیں ہو۔ میں جانتا ہوں۔"

"سنو! میں نے ایک پڑھے لکھے بندے سے شادی کی تھی۔ کسی کسان سے نہیں۔ میں تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔ تمہیں میرے پاس آنا ہو گا۔ یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ وہ حیرانی سے سوچتے رہ گئے۔ اس کا لہجہ انتہائی ہتک آمیز تھا۔ اس کی آواز میں غرور تھا۔ کس قدر مختلف تھی یہ خجستہ۔ اس خجستہ سے۔ جو لندن میں سہمی سہمی سی آواز سے شہد ٹپکتا تھا۔ اور جس کی خوش اخلاقی اور تہذیب کے وہ معترف تھے۔ یہ نقاب اس قدر عارضی ہو گا۔ انہیں اس کا افسوس تھا۔

خجستہ کو جھکانے میں انہیں مایوسی ہوئی تھی۔ اور وہ خود جھکنے پر تیار نہ تھے۔ وہ حق پر تھے۔

بچے ماں کو یاد کرتے تھے مگر خوش تھے۔ ہر روز آنٹی موقی کے ساتھ بجوات کا سفر کرنا، اور اسکول سے پھر تانگوں پر گاؤں آنا۔ شام کو دریائے سیدا کے کنارے ریگ بستہ پانی میں کھیلتے ہوئے ایک دوسرے کو دریا میں دھکا دیتے پھر سردی سے سسکیاں لیتے ہوئے باہر نکلتے۔

دریا پار جموں کا علاقہ تھا۔ رات کے وقت جموں شہر سے باہر کی سڑکوں کی روشنیاں نظر آتیں۔ ٹھنڈی ہوا، مہکتی فضا، جنگل، دریا، پہاڑ۔ یہ حسین علاقہ جہاں جنت کے نظارے تھے ان کا اپنا تھا۔

اماں کو موقی کے بے سہارا ہونے کا اتنا احساس تھا کہ وہ پھر سے بیمار ہو گئیں۔ ادھر بیٹے کی اذیت ناک تنہائی، خجستہ کی نند کبھی وہ ان سے کہتیں۔

Scan & PDF FIAZ AHMED Digital Kothi.com

"جا کر لے آئیے۔ اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دے بیٹا۔ اونٹ کسی کل بیٹھے تو۔"

"اس کی خواہش نہیں ہے اماں۔ ضد ہے۔ بہت مغرور ہے وہ بہت خوبصورت ہے نا۔"

"اور میں نے اس کے حسن کو خراج دے دے کر اور بھی مغرور بنا دیا۔"

"بیٹا۔ موتی کا بھی کچھ سوچ۔ میں مر نہیں سکتی چین سے۔ جب تک اس کا کچھ نہ ہو جائے۔"

"اچھا ہے نا اماں۔ مجھے بھی آپ کی زندگی چاہیے۔"

"ٹال مت بیدی! کہیں سے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈ کر اس کا ٹھکانہ بھی بنا۔"

رشتہ۔ یعنی یہ موٹی آواز والی، تیز لہجے میں بولنے والی اور بد لحاظ بولنے والی کالی لڑکی۔ جس کی دلیری اور ایثار کے چرچے گھر گھر ہیں۔ جو مجھے گھاس نہیں ڈالتی جو بچوں کی ہر خوشی پوری کرتی ہے۔ ان کے ساتھ کھیلتی ہے۔ ہنستی ہے۔ رات کو نصیحتوں بھری کہانیاں سناتی ہے۔ لوری دے کر سلاتی ہے۔ جس نے اماں کو زندہ رکھنے کے ہزار جتن کیے۔ جس نے ان کے ایک جملے کو زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اماں کے لیے سیسہ پلائی دیوار بن گئی۔ نوکری کرتی رہی اور زمین واپس لے کر کاشت کرواتی رہی اماں کسی دن بھوکی نہیں سوئیں۔ بے علاج نہیں رہیں۔ وہ ان کی خدمت کسی جن کی طرح کرتی رہی طاقت سے بڑھ کر کام کیے۔ اور کبھی احسان نہیں جتایا۔ لوگ تو درخشندہ تک جوان کی شریک حیات ہے) ذرا ذرا سے کام اپنے فرائض تک کے احسان لادتے ہیں۔ یہ دنیا سے الگ کیوں ہے؟

"موتی!" انہوں نے آخر اسے گھیر ہی لیا۔ "اب اماں تمہارا بوریہ بستر گول کرنا چاہتی ہیں۔"

وہ منہ اٹھائے انہیں دیکھتی رہی۔

"اگر کوئی ایسا ہو۔ جو تمہیں اپنانا چاہتا ہو۔ اور تم بھی اس کے لیے سوچتی ہو۔ مجھے بتا دو۔ میں کوشش کروں گا۔"

انہوں نے سنجیدگی سے بات کی اس نے سر جھکا لیا۔ ہاتھ میں پکڑی کتاب کو بند کر کے بستر پر ڈال دیا۔ پھر انکار میں گردن ہلائی۔ انہیں سچی خوشی ہوئی۔

"تو پھر۔ تم نے اتنا انتظار کیوں کیا؟ میں سمجھتا تھا کہ شاید۔"

"تم غلط سمجھ رہے تھے۔ انتظار تو مجھے تھا۔ تمہارا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"تم خالہ کو میری سپرداری میں دے گئے تھے۔ میں یہ امانت زندہ حالت میں تمہیں واپس کرنا چاہتی تھی اب میرا انتظار ختم ہو گیا ہے۔"

اس دن ادریس کے پیر میں کانٹا چبھ گیا۔ موتی کانٹا نکالنے کی کوشش کرتے کرتے خود بھی رونے لگی۔ ادریس بھی رو دیا۔ کانٹا نکل گیا مگر چبھن باقی تھی۔ وہ بھوں بھوں کر کے رو رہا تھا۔ بیدی تے اسے گود میں اٹھا لیا اور اپنے کمرے میں لا کر لٹا دیا۔

وہ امی امی کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ رات گئے تک ابھی کا رونا جاری تھا۔ وہ سوچنے لگے اب خجستہ کو آجانا چاہیے۔ ماں ہی اپنے بچوں کی دل دہی کر سکتی ہے۔ انہوں نے آہستہ سے ادریس کو سہلایا اور کہا۔

"اچھا بیٹا۔ کل ہم اپنے بیٹے کو کراچی لے چلتے ہیں امی کے پاس۔ اب چپ ہو جاؤ نا۔"

ادریس نے ادریس کو دیکھتے ہوئے باپ سے کہا۔

"یہ کراچی جانے کے لیے تو نہیں رو رہا ڈیڈی۔"

"مگر امی امی تو کر رہا ہے نا۔"

"یہ تو آنٹی کو بھی کبھی امی کہہ دیتا ہے۔ جب وہ اسے لوری سنا کر سلاتی ہیں تو اسے اچھی نیند آتی ہے۔ آپ اسے اپنے کمرے میں لے آئے۔ وہ یہاں تو نہیں آسکتیں نا؟"

وہ حیرت سے ادریس اور ادریس کو دیکھنے لگے۔

"آپ آنٹی کو امی بنا دیں نا ڈیڈی۔ پھر تو وہ اس کمرے میں آسکیں گی۔"

انہیں دادی نے یہ پٹی پڑھائی تھی۔ وہ حیران رہ گئے۔ بچوں نے فیصلہ کرنے میں کوئی دیر نہ لگائی۔ بیدی کو اماں کے قرب میں بڑا سکون ملتا۔ وہ گزشتہ سلوک کی تلافی کرنا چاہتے تھے اس لیے ہر وقت ماں کے ساتھ تھے۔ اماں بھی مطمئن تھیں۔

"جب تو نے شادی کا خط بھیجا۔ میں بڑا روئی۔

تڑپی۔ موتی بھی روتی تھی میرے ساتھ۔ پھر تو لاپتا ہو گیا۔ میں دن رات رویا کرتی۔ تب یہ موتی بڑی تسلیاں دیتی تھی مجھے۔ یہ نہ ہوتی تو میں مر جاتی۔ اس کے کتنے ہی اچھے اچھے رشتے آئے۔ اس کے بھائی اسے لینے آئے پر یہ نہیں گئی۔ یہ کہتی تھی کہ خالہ اکیلی ہیں۔ انہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ پر بیٹا۔ وہ یہ گھر چھوڑے بھی کیوں۔ اس کے بہت احسان ہیں۔ مجھ پر۔ تجھ پر۔ اس گھر پر اس کا بھی حق ہے۔ اس نے مردوں کی طرح کما کر پالا ہے مجھے۔ یہ بتا کبھی تجھے میری یاد بھی آئی؟ کبھی تو نے موتی کے بارے میں بھی سوچا؟ بتا، بتا، بتا بیٹا؟"

اماں کا سوال خنجر کی طرح دل میں اتر گیا۔

"خجستہ! تو نے مجھے میری زمین سے جدا کیا۔ اپنے پھندے میں گرفتار کیا۔ میں اپنی زمین سے دور ہو گیا جو میری ماں تھی۔ اور اپنی ماں سے بھی دور رکھا۔ جو میرا آسمان تھی۔ خجستہ۔ میری ماں کے آنسو میری جدائی میں رستے رہے ہیں ان آنسوؤں کا حساب لوں گا۔ وہ تڑپ کر رہ گئے۔

ایک سیاہ فام خود دار لڑکی کی کشش بھی انہیں زمین کرنے لگی۔ زمین آسمان کی محبت کے ساتھ۔ یہ میری کشش تھی۔ وہ جو اماں کی جیتی جاگتی شبیہ۔ وعدے کی پکی اور ارادے میں لاثانی تھی۔ وفادار اور بانکپن میں بے نظیر۔ دل کی آواز پر وہ کراچی میں ایک فیصلہ کر چکے تھے جو خجستہ کے حق میں تھا۔ اب دماغ اشارے کر رہا تھا۔

اماں مددگار اور حامی۔ مایوسیوں میں گھرے انسان کی طرح وہ تنکے کا سہارا لینے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کوئی ناپسندیدہ وجود اپنی خوبیوں کو خفا لی میں لیے پیش کرے۔ تو وہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ پسند کیے جانے پر مجبور کر دیتا ہے خجستہ نے مایوس کر دیا تھا۔ دل خالی تھا۔ دماغ اماں کی تابعداری پر مجبور۔

وہ انتظار کی شمع روشن کیے بیٹھے تھے۔ خجستہ اندھیری سرنگ میں سفر کر رہی تھی۔ اماں نے بڑی خوبصورت سی جھلملاتی ساڑھی موتی کے سامنے رکھ دی۔

"لے موتی! بڑی خوبصورت ساڑھی ہے۔ کبھی تو نے ایسے کپڑے نہیں پہنے۔ ذرا پہن کر دکھا۔ بیدی لایا تھا۔" انہوں نے جملہ پورا کیا۔

"میرے لیے؟ یا اپنی بیوی کے لیے؟" سوال نہیں زہر میں بجھا تیر تھا۔ وہ بھنا کر رہ گئے۔ یہ تلخی یہ زہر کہاں سے لیا ہے تو نے موتی۔

"اب۔ تمہیں ہی بہو بنا کر پڑے گا۔" وہ زور سے چلائے۔ غصہ بھی تھا غم بھی۔ مایوسی بھی اور بچوں کی اجازت بھی۔ مگر در اصل اسی حربے سے وہ خاموش ہوتی تھی۔ اسے پسپا کرنا ضروری تھا۔ اس کی پسپائی مردانگی کے غرور کے لیے بے حد ضروری تھی۔ اس نے ہمیشہ ان کی تحقیر ہی کی تھی۔

"اماں! تم کل ہی قاضی صاحب کو بلاؤ۔ میں اب اور دیر نہیں کر سکتا۔" لہجہ دبنگ تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سانولے چہرے پر انگاروں جیسی رنگت دہک گئی۔

"کیا کہا؟" پوری طاقت سے چیخ کر اس نے کہا۔ "مسٹر بیدار بخت کان کھول کر سن لو۔ مجھے استعمالی چیز پہننے کی عادت نہیں ہے۔ خواہ وہ کتنی بھی قیمتی اور اعلا درجے کی ہو۔ اور سن لو کہ تم بھی خجستہ کی اترن ہو۔ سنا؟"

وہ انوکھی، نرالی، یکتا، لاثانی منفرد لڑکی ایک ہی جملے میں انہیں ذلیل کر کے ان کی اوقات یاد دلا کر کمرے میں جا گھسی۔ اور اپنے کپڑے بکس میں ٹھونسنے لگی۔

اماں بیٹے ساکت بیٹھے رہ گئے۔ سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

پھر دروازہ دھڑاک سے کھلا تھا۔ صحن میں بدحواس پریشان حال خجستہ نے قدم رکھے۔ وہ جھک گئی تھی۔ موتی بکس اٹھائے صحن میں آگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا، پھر موتی سر اٹھائے گھر سے باہر۔ اور خجستہ اندر آگئی۔

پتا نہیں کون پسپا ہوا تھا۔ کس نے پسپائی خوشی سے قبول کی؟

(وہ اکھڑ، بدتمیز سی موتی قوس فخر سے بلند کیے باہر گئی تھی۔)

☼

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com